یہ سچ ہے
شاہینہ رضوی

شاہینہ رضوی

نام کتاب : "یہ سچ ہے"

نام مصنف : ڈاکٹر شاہینہ رضوی۔

قیام : این ۱۲/۱۱۸۲، شیوراج نگر، وارانسی ۱

فون:0542-3260444

اشاعت اوّل : ۲۰۰۸ء

تعداد : چارسو

ناشر : مصنف

کمپوزنگ و پرنٹنگ : زرنگار کمپیوٹر کمپوزنگ سینٹر،

باگڑ بلی، مدن پورہ، وارانسی

فون:2455160-161 موبائل:9336928764

قیمت سو روپے۔ Rs. 100/00

ملنے کا پتہ:

☆ این ۱۲/۱۱۸۲، شیوراج نگر، وارانسی

انتساب

فہرست

میرا سچ

کہانیاں لکھنے کی ترغیب مجھے اس وقت ملی جب میں بارہویں کلاس میں تھی۔ ہماری اردو ٹیچر مرحومہ قریشہ خان نہ صرف اچھی معلّمہ تھیں بلکہ بہت مخلص انسان بھی تھیں اور ہمیشہ ہم لوگوں میں جستجو وکاوش وتخلیق کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ ان کے کہنے پر میں نے بھی دو کہانیاں لکھیں۔ لیکن اب نہ وہ کہانیاں ہیں نہ مجھے ان کے پلاٹ یاد ہیں۔

اسکے بعد بھی کہانیاں لکھتی رہی لیکن میں کبھی خود ہی مطمئن نہ ہوسکی اور کافی عرصے تک میں نے کہانیاں نہیں لکھیں۔ اس کہانی کے مجموعے میں پچھلے دس بارہ سال کے عرصے میں لکھی گئی کہانیوں سے کچھ کا انتخاب پیش کر رہی ہوں ۔ یہ خیال بھی اچانک ہی آیا کہ کیوں نہ ایک مجموعہ اپنی کہانیوں کا پیش کروں۔ حالانکہ اس کی ترغیب میرے شوہر اور بچّے برابر دیتے تھے لیکن میں ہی اپنے کو پرکھ نہیں پا رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا یہ تو رے اپنے ہیں انھیں تو میری ہر چیز اچھی لگے گی۔ پھر میں نے ہمت کر کے کچھ کہانیاں پروفیسر فضل امام صاحب کو سنائیں اور جب انھوں نے بھی اشاعت کی اجازت دے دی تو ہمت کر ڈالی۔ اس ہمت میں میرے ہم شعبہ و ہم پیشہ ڈاکٹر محمد اشتیاق صاحب کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ خیر مجموعہ ''یہ سچ ہے'' آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

گر قبول افتذ زہے............

شاہینہ رضوی

نومبر ۲۰۰۷ء

ایک کہانی ادھوری سی

کبھی کبھی کوئی کہانی پڑھ کر زندگی کی حقیقتوں کی کتنی تہیں کھل جاتی ہیں۔ وہ حقیقتیں جن کو ہمیشہ پابند حجاب رکھا ہو بالکل بے جھجک ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ حقیقتیں کتنی حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ بڑے بڑے نظریات پیش کئے گئے لیکن من کے باولے پن کو کبھی کوئی پیمانے میں نہ باندھ سکا۔

میری اپنی پڑوسن فرزین سے بہت اچھی دوستی تھی۔ شام کا وقت تھا مجھے معلوم تھا کہ ان کے شوہر مسٹر ریاض نو بجے سے پہلے گھر تشریف نہیں لاتے۔ بقول فرزین یہ ان کا ایسا جنم سدھ ادھیکار ہے جس سے نہ وہ کبھی دست بردار ہوتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ارے بھئی شادی شدہ تو میں بھی ہوں میرے دو بچے بھی ہیں۔ ایک بارھویں میں ہے ایک نویں میں۔ میرے شوہر؟ ارے بھئی وہ ٹھیک پانچ بجے گھر پر ہوتے ہیں۔ چائے ناشتہ کھانا سب ہم لوگ ساتھ کھاتے ہیں۔ باقی وقت بچے کبھی ہوم ورک کرتے ہیں۔ کبھی پارک میں ہوتے ہیں اور میرے شوہر بالکل شریف لوگوں کی طرح گھر پر ہی رہتے ہیں لیکن ٦ سے آٹھ

بجے تک اخبار کی ایک ایک خبر پڑھنا ان کی ضروریات زندگی میں شامل ہے۔ اور میرے لئے سب سے بورنگ وقت بھلا یہ بھی کوئی بات ہے دو انسان ایک چھت کے نیچے ہوں اور ان میں کوئی گفتگو نہ ہو رہی ہو۔ میں باتیں کرنا چاہتی ہوں لیکن جناب سننا ہی نہیں چاہتے۔ اس کا سب سے اچھا حل میرے پاس تھا فرزین سے باتیں کرنا اور اس بے لطفی کو دور کرنا۔

آج بھی میں اس وقت فرزین کے گھر چلی گئی۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ میرے شوہر پر نہ میری موجودگی کا اثر ہوتا ہے اور نہ غیر موجودگی کا اور میں اس وقت اپنے کو ایک ناکارہ سی شے محسوس کرتی ہوں۔ اس لئے عورت کے ان فرائض سے جن میں شوہر کے دفتر سے آنے پر خوش رکھنے کے لئے اس کے ہر فرمان کو پورا کرنا۔ دو گھنٹے بالکل آزاد رہتی ہوں۔

یوں فرزین بھی عادی ہو گئی ہیں مسٹر ریاض کی عادتوں کی عام طور پر عورت ازدواجی زندگی میں کچھ ہی عرصے میں اس چاہت کا خیال چھوڑ دیتی ہے کہ شوہر اس کے لئے کچھ سوچے۔ شوہر کے لئے بیویوں کی ذہنی آسودگی کوئی معنی نہیں رکھتی بستر کا ساتھی ہونا اور روٹی کپڑا دینا شوہر کا فرض ہوتا ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلّیٰ۔

فرزیں ایسے وقت پر نہ کبھی غم زدہ دکھائی دیں نہ کھلی ہوئی کبھی بیزار بھی نہیں لگیں۔ میرے پہنچنے پر بہت خوش ہوتی ہیں۔ لیکن آج وہ کسی کام میں مصروف نہیں تھیں۔ حیرت ہوئی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا کر خیر مقدم تو کیا لیکن پھر جیسے

کھوسی گئیں آخر مجھ سے برداشت نہ ہوا۔

''کیا بات ہے آج آپ کا وہ معمول نہیں ہے؟

''کون سا معمول؟''

''وہی خوش مزاجی سے سارے کام چھوڑ کر باتیں کرنا؟''

''ہوسکتا ہے۔''

''کوئی تو بات ہے۔''

''شاید'' پھر خود ہی بولیں آج ایک کہانی پڑھی تھی۔ بنیادی کردار ہم لوگوں کی عمر کی ہی ایک عورت تھی۔

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے۔اپنے ماں باپ کے گھر میں ہماری دنیا کچھ اور تھی۔Generation Gap کا وہ تصور ہی نہیں تھا جس کا احساس آج کے بچوں کو شدت سے ہے اور اپنے کو صحیح ٹھہرانے کا ایک آسان راستہ بھی۔ہم کو یہ احساس کیوں نہیں تھا؟،،انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

آج فرزین کا موڈ بالکل الگ سا لگ رہا تھا۔میں نے جواب دیا۔

''دنیا کی دوسری ایجادات کی طرح یہ بھی ہمارے وقت میں ایجاد نہیں ہوا تھا اس لئے ہم اپنے بڑوں کی مرضی میں ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ہمیں احساس ہی نہیں تھا کہ ہمارے اور ہمارے ماں باپ کے بیچ کی دوری

Generation Gap ہے۔اوران سے الگ محسوس کر سکتے ہیں۔،،

''اچھا یہ بتاؤتم نے کبھی محبت کی تھی؟'' اچانک انہوں نے ایک بالکل الگ قسم کا سوال کرڈالا۔ میں سمجھ نہیں پارہی تھی کہ اس سوال کا اس وقت ہو رہی باتوں سے کیا تعلق ہے۔ہم تقریباً ۲۰ ر سال سے ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں ۔ایک دوسرے کی زندگی کے بہت واقعات سے واقف ہیں لیکن یہ ذکر کبھی نہیں آیا۔اس لئے میں حیرت زدہ سی فرزین کو دیکھنے لگی۔

''ارے راشدہ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔ذرا غور کر کے بتاؤ؟''

اور واقعی میں نے غور کرنا شروع کر دیا۔ماضی کے کئی اوراق ایک ساتھ پلٹ ڈالے اور شادی سے پہلے کے دن یاد کرنے شروع کر دیئے۔کسی سے عشق ہوا تھا؟ یاد نہیں آیا تو سوچنا شروع کیا کسی سے عشق ہو سکتا تھا۔اچانک ایک واقعہ یاد آیا۔جس کی معیاد ایک ہفتہ تھی۔بس اتنا ہی وقفہ شروعات Climax اور انجام کیا یہ عشق تھا؟ میں کچھ سمجھ نہ پائی۔

میں نے بارھویں پاس کر لی تھی۔ایک ڈگری کالج سے بی اے کر رہی تھی اکثر کاپی کتابیں لے کر اوپر کی منزل پر اکلوتے کمرے میں چلی جاتی تھی ۔بھلا لڑکیوں کے بھی پڑھنے کے لئے جگہ مہیا کرنا چاہئے۔ایک دن اچانک نظر پڑی تو ایک مکان کی چھت پر کوئی لڑکا کھڑا تھا وہ مکان کئی مکانوں کی دوری پر تھا۔ان لوگوں سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ مجھے سخت کوفت ہوئی۔سیڑھیاں اترنے ہی والی تھی سو نیچے چلی آئی۔

دوسرے دن شام کو جب پھر اوپر گئی اور پڑھنے کے لئے بیٹھ بھی گئی تو اچانک (یا پھر یہ میرے لاشعور کا حکم تھا) میری نظر ادھر ہی اٹھ گئی۔ وہ لڑکا چھت پر کھڑا تھا۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری دروازے کا پردہ برابر کیا اور پڑھتی رہی اور جب نیچے اترنے لگی تو اندھیرا ہو چلا تھا غیر ارادی طور پر نظر اسی چھت کی طرف تھی تو وہ سایہ وہیں نظر آیا میں تیزی سے نیچے آ گئی۔ اگلے دو تین دنوں تک اسی لئے اوپر جاتی تھی کہ دیکھوں وہ ہے یا نہیں۔ اور جب اس کا وہاں ہونا اچھا لگنے لگا تو ایک دن میرے پیچھے پیچھے اماں بھی اوپر آ گئیں۔ میں دیر سے ادھر ہی دیکھ رہی تھی لڑکا بھی چھت پر تھا۔ تبھی اماں کی آواز سنائی دی۔

''راشدہ چلو کھانا پکوانے میں آپا کی مدد کرو رات میں خالہ اماں کے گھر چلنا ہے۔''

شاید میں نے چوری شروع کر دی تھی لیکن اماں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ میں مطمئن ہو گئی۔

آپا کی شادی طے ہو چکی تھی۔ تین ماہ بعد ان کی شادی ہونی تھی۔ میری نسبتیں آ رہی تھیں لیکن ابّا میرے بی۔ اے کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ دوسرے دن جب میں کالج سے گھر آئی تو اوپری کمرے میں سلائی مشین اور کپڑے وغیرہ پہنچ چکے تھے اور آپا کے شادی کے کپڑوں کی سلائی اسی چھت والے کمرے میں ہو رہی تھی۔ جلدی ہی میری بھی شادی طے کر دی گئی۔ آپا کے ساتھ میری بھی شادی ہو گئی۔ آج فرزین کے پوچھنے پر محسوس ہوا کہ یہ واقعہ عشق میں بدل سکتا تھا

لیکن اماں نے کتنی مشاقی سے اس کا گلا گھونٹا اس کا مجھے احساس ہو رہا تھا اب ایسے ایک ہفتے کے قصے کی کسک کیا ہوتی میں نے جواب دیا۔

''عشق کیا تو نہیں لیکن ہو سکتا تھا۔ آج اماں کی ہوشیاری کی داد دے رہی ہوں'' اور سارا قصہ ان کو سنا ڈالا۔

''لیکن میں نے پیار کیا تھا'' فرزین نے بڑے سکون سے کہا مجھے یقین نہ ہوا۔ یہ بردبار قسم کی خاتون۔ یہ پیار کر سکتی ہیں؟ یہ کبھی مسٹر ریاض کے رویئے کی شکایت تو کر نہ سکیں۔ یہ عشق وشق کیسے کر سکتی ہوں۔ کچھ کچھ خود کلامی میں مشغول تھیں۔

''وہ مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ میرے دور کے رشتے دار تھے۔ چونکہ کہ ان کے گھر میں عورتیں نہیں تھیں اور ماں بھی انتقال کر چکی تھیں۔ اس لئے اماں ان کے گھر میں نہیں جاتی تھیں۔ کبھی کبھار ان کے والد اور ان کا چھوٹا بھائی آ جاتے تھے۔ دونوں بھائی ہاسٹل میں رہ کر پڑھ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم وہ کب میرے آئیڈیل بن گئے اور کب ان سے پیار کرنے لگی۔ وہ بہت خوبصورت تھے میرے حساب سے میں ویسی خوبصورت نہیں تھی۔ پھر بھلا وہ مجھے کیوں پسند کریں گے میں چار پانچ سالوں تک اسی یقین پر جیتی رہی اور ان کو پیار کرتی رہی لیکن کبھی بات کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ انھوں نے بھی کبھی کچھ نہ کہا لیکن ان کو اسی طرح پیار کرتی رہی اسی یقین پر جیتی رہی کہ یہ پیار یک طرفہ ہے۔ سوچتی کاش کچھ جادو ہو جائے اور میری شادی ان سے ہو جائے اور ایک دن

واقعی جادو ہوگیا ان کے گھر سے ان کے لئے رشتہ آیا۔ پتا چلا میں انھیں کی پسند ہوں گھر والے بھی مجھے پسند کرتے تھے کچھ دنوں تک دونوں طرف چرچے ہوتے رہے۔ باتیں ہوتی رہی اور میں آسمانوں میں اڑتی رہی۔ وہ بھی مجھے پیار کرتے ہیں۔ اس احساس سے جو خوشی ہوئی اسے بیان نہیں کر سکتی لیکن جانے کیسے رشتہ ختم ہوگیا اور جادو بھی ٹوٹ گیا۔ سنا تھا ان کو بھی چوٹ پہنچی۔ لیکن شاید بڑوں کے خلاف بول نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ہم دونوں کی الگ الگ شادیاں بھی ہوگئیں۔ سنا تھا ان کو شروع میں بیوی سے Adjust کرنے میں بہت مشکل ہوئی۔ وہ مجھے اتنی شدت سے پیار کرتے تھے اس کا مجھے اندازہ بھی نہ تھا لیکن آج بھی ان کے نہاں خانوں میں میں ہوں اور میرے اندر وہ چھپے ہوتے ہیں اس وقت اگر ہم بھی Generation Gap سے واقف ہوتے تھے تو کیا حالات دوسرے ہوتے؟ تو ہم اپنی بات منوا سکتے؟ یہ سوال اب بھی ذہن میں اٹھتے ہیں لیکن ہم شاید کسی دوسرے ہی مٹی کے بنے تھے کہ ہم اپنے دل کی بات بھی ایک دوسرے سے نہ کہہ سکے۔ میں اب بھی اپنے گھر جاتی ہوں تو اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اور میں ان کی آنکھوں میں جو اتھاہ اپنائیت دیکھتی ہوں تو مسٹر ریاض کے دیئے ہر زخم کو بھول جاتی ہوں شاید مجھ میں یہ سب برداشت کرنے کی طاقت ہے کہ کوئی تو میرا ایسا ہے۔ آج ایک کہانی پڑھی جس میں ایسے ہی دونوں طرف سے اظہار نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ دونوں میں باتیں ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے کے جذبات سے بھی واقف تھے لیکن لڑکا شادی شدہ تھا اس لئے

دونوں نے اپنے پیار کی قربانی کر دی ۔لیکن میں کیوں قربان ہوگئی ۔عاصم نے کچھ کیوں نہ کہا؟ کیا اسے بھی شبہ تھا کہ پتا نہیں میں پیار کرتی ہوں یا نہیں؟ یا وہ واقف تھا؟ ہم بے وجہ ہی جدا ہو گئے ۔اس کہانی میں جب ہیروئن کہتی ہے'' زندگی میں کافی عرصے کے بعد اس سے ملنا ہوا اور پھر میں نے نہ ملنے کی قسم کھائی'' تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔میرا تو گوشہ گوشہ اسی سے روشن ہے۔ میں تو یہی چاہوں گی کہ میری آخری سانس انھیں کے سامنے ٹوٹے ۔شاید وہ مل گئے ہوتے تو آج مجھے دکھ نہیں ملتے ۔وہ خاموش ہوگئیں۔

میں نے بھی ایک بار سوچا کہ اگر وہ ایک ہفتہ والا لڑکا مل گیا ہوتا تو میری زندگی کیسی ہوتی؟

شاید وہ شام کو دو گھنٹے تک اخبار نہ پڑھتا اور میں بور نہ ہوتی رہتی۔

ترقی پسند

میں کمیونزم سے شاید سات آٹھ سال میں ہی متعارف ہوگئی تھی۔ اپنے ایک چچا کے ذکر کے ساتھ۔ ناظم چچا کمیونسٹ ہیں۔ وہ مسلمان نہیں رہ گئے۔ اسی مردار روس کی وجہ سے اماں کو کچھ زیادہ ہی غصہ تھا۔ ناظم چچا نہ صرف کمیونسٹ ہوگئے بلکہ انھوں نے شادی سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس کا دکھ دادی کو بھی تھا اور اماں کو بھی۔ دادی کو اس لئے بڑی بہو یعنی اماں میں جو کمیاں تھیں۔ اس کا جواب چھوٹی بہو سے چاہتی تھیں اور اماں کو اس لئے کہ اگر دوسری بہو آجاتی تو اماں کے ہاتھ بھی مضبوط ہو جاتے۔ اور دوسری بہو جو بھی غلطیاں کرتی اسکا طعنہ وہ دادی کو دے سکتیں لیکن ناظم چچا تو صاف بچ نکلے ان کو کوئی بھی استعمال نہ کر سکا۔

جہاں اماں اور دادی کا یہ خیال تھا کہ غلط لوگوں کے ساتھ نے ن کو ملحد بنا ڈالا تھا وہیں ابا کا خیال تھا کہ بچپن سے ہی وہ بے وقوف تھا اس لئے اسلام کو سمجھ ہی نہ سکا اور زبردستی کمیونسٹ بن گیا۔ ارے اشتراکی فلسفہ کا صحیح روپ تو اسلام میں ہی موجود تھا۔ بہر حال کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے چچا کی خوب لے دے ہوتی۔

میں اپنے چاروں بھائی بہنوں میں انہیں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ ابا تو

بات بات میں چلاتے ہیں۔ میں سوچتی اور چچا کتنے اچھے ہیں۔ آہستہ آہستہ بولتے ہیں بھلا چچا بھی کہیں کمیونسٹ ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس بات پر شبہ تھا۔ تب میں سمجھتی تھی کہ کمیونسٹ کوئی بہت خطرناک چیز ہوتی ہے۔

ہاں تو چچا مجھے بھی بہت عزیز تھے۔ ان کے گھر میں آتے ہی ہم سب بھائی بہن خوش ہو جاتے۔ جانے کیا کیا تو کھلاتے اور کہاں کہاں تو گھماتے۔ وقت بڑھتا گیا اور میرے نظریوں میں تبدیلی آتی گئی اور کمیونزم بھی واضح ہوتا گیا لیکن جب تک یہ باتیں اچھی طرح سمجھ پاتی چچا نے جانے کیوں ملک چھوڑا انگلینڈ جا بسے اور وہیں شادی بھی کر لی۔ لیکن مجھ میں ضرور اپنے جراثیم چھوڑ گئے۔ آہستہ آہستہ میں بھی کمیونزم سے متاثر ہوتی گئی میرا جھکاؤ اس طرف بڑھتا گیا۔

لیکن میں دو دنوں سے عجیب کشمکش میں ہوں کچھ سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ میں ہمیشہ کمزوروں کی حمایتی تھی۔ غریبوں کی طرف داری کرتی تھی۔ چچا بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ پھر انہوں اس غریب ملک کو کیوں چھوڑ دیا۔ ان کو کون سا تجربہ ہوا تھا؟ مجھے جو تجربہ ہوا ہے اس نے میرے سارے اصول و نظریات میں ہلچل مچا دی ہے۔ میں چچا سے باتیں کرنا چاہتی ہوں پوچھنا چاہتی ہوں۔

تقریباً ایک سال پہلے گھر کے کام کے لئے ایک عورت لگائی تھی۔ ایک روایتی بوا۔ آدمی نے دوسری شادی کر لی۔ بچوں کو بھی نہیں پوچھتا۔ مجھے بھی اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ کھلتی گئی۔ پھر اپنی لڑکی کو بھی ساتھ لانے لگی بڑی لڑکی کسی اور گھر میں کام کرتی تھی اور وہیں کھاتی پیتی تھی۔ چھوٹی لڑکی

گیارہ بارہ سال کی تھی اور ماں کے ساتھ کام کرواتی ۔ پہلے دن جب وہ آئی اور ماں کے ساتھ کام کرنے لگی تو میں نے اپنی اسی عمر کی بیٹی کو دیکھا جو بڑے آرام سے صوفے پر اوندھی لیٹی کوئی کہانی پڑھ رہی تھی ۔ میں نے گھبرا کر نظریں ہٹالیں مجھے اپنی بیٹی مجرم نظر آرہی تھی ۔ بھلا اسی کی عمر کی لڑکی کام کرے اور وہ آرام سے لیٹی ہو۔ ہے نہ ناانصافی ۔ میرا رویہ ''بلو'' کے لئے ہمدردانہ ہوتا گیا ۔ اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ میرے گھر رہنے لگی ۔

میں نے اس کو پڑھانا شروع کیا ۔ (میں سچی انسان جو ہوں) پوری لگن سے لگی رہی لیکن روز آنہ کی دردسری کے بعد آٹھ ماہ کا نتیجہ نکلا بیس تک گنتی اور آٹھ دس حروف کی پہچان اور لکھائی ۔ مجھے اپنے پڑھانے کی صلاحیت پر شبہ ہونے لگا اور شرمندگی بھی اب کیسے کیا کروں سمجھ نہیں پا رہی تھی اور اس کا رجحان کسی طرح نہیں بنا پا رہی تھی ۔ ویسے میں نے اس لڑکی میں اور تبدیلیاں ضرور دیکھیں ۔ سکھانے سے صاف ستھری رہنے لگی اور ایک غرور بھی جو وہ اپنے رشتے داروں کے مقابلے میں دکھاتی تھی ۔ کبھی اس کے ساتھ کوئی رشتہ دار آتا تو حقارت بھرے لفظوں سے اس کا تعارف کراتی ۔

اس کی ماں اکثر مجھ سے پیسے لے جاتی کبھی ایڈوانس کے نام پر کبھی غریبی کے نام پر ''بلو'' البتہ میرے گھر میں زیادہ وقت گذارتی ۔ آہستہ آہستہ اس کے طور طریقے زیادہ بدل گئے ۔ ڈری سہمی رہنے والی لڑکی اکثر بات نہ سنتی ۔ کچھ کا کچھ بولتی رہتی ۔

اور پھر اس نے شام کے وقت میں کٹوتی شروع کی پہلے دن کا کھانا کھا کر جاتی اور پانچ بجے پھر آجاتی۔ لیکن اب دن کا کھانا کھا کر جاتی تو رات کے آٹھ بجے سے پہلے نہ آتی تب تک زیادہ تر کام میں کر چکی ہوتی۔ دیر سے آنے کی وجہ یہ بتاتی کہ گھر پر بہت کام تھا۔ کھانا لیتی اور چلی جاتی۔ اب تک اس کی تنخواہ بھی کافی بڑھا چکی تھی اور جب تک کوئی انتظام نہ ہو جائے ہٹاتے بھی نہیں بن پڑتا تھا کہ میں بھی نوکری پیشہ تھی۔

کئی بار کہا ذرا پہلے آجایا کرو لیکن اس کا وہی جواب کہ اور جگہ کام کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس کی ماں بھی نہیں آرہی تھی۔ مجھے نوکر کی ضرورت ہے اس مجبوری کو وہ سمجھ چکی تھی اور میں اپنی ہمدردیوں میں پھنس چکی تھی۔

تین چار دنوں بعد مجھے ایک راہ سوجھی کہ اسے اور کسی گھر میں کھانا نہیں ملتا ہے۔ میرے ذہن میں جو ترکیب کوندی اس نے مجھے ہی پریشان کر دیا۔ میں ایک کشمکش میں ہوں کہیں میں کچھ ناانصافی تو نہیں کر رہی ہوں۔ یا اس لڑکی نے میری ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ اصل میں دو دنوں سے میں نے دن کا کھانا دینا بند کر دیا اور کہہ دیا کہ چار بجے کھانا لے جائے اور حیرت کہ وہ لڑکی جو رات آٹھ بجے آتی تھی۔ چار بجے شام کو ہی کام پر موجود میں کھانا کھلاتی ہوں۔ پھر وہ شام کے کام کرتی اور رات کا کھانا لینے آتی لیکن میں۔

میرا کمیونزم کا ایمان ہلنے لگا ہے۔ کون مظلوم ہے۔ یہ لڑکی یا پھر میں اگر یہ پابندی نہ لگاتی تو؟ اور مجھے ناظم چچا بہت یاد آرہے ہیں۔

چپلیں

جیسی کہ امید تھی چاند نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تو ہر طرف بے ترتیبی تھی ۔ سارا کمرہ اجڑا ہوا تھا۔ فرش پر جگہ جگہ جوتے چپل اور موزے پڑے ہوئے تھے ۔ بستر کی چادر کے دو کونے دبے ہوئے تھے ۔ ایک پلٹا اور ایک باہر نکلا ہوا۔ ڈرائنگ روم کی میز پر کاغذ اور پولی تھین کے بے شمار لفافے پڑے ہوئے تھے ۔ دو تکیے ڈرائنگ روم میں پڑے تھے ۔ ایک پر غلاف تھا ایک غلام سے بے نیاز ۔ دل تو چاہا سب کچھ الٹ پلٹ دے لیکن کرنا اسی کو پڑتا ۔ ۲۵/سال سے یہی ہوتا آرہا ہے ۔ پہلے تو اس نے اپنا پرس ایک طرف رکھا پھر چادر ٹھیک کر کے بستر پر لیٹ گئی ۔ عمران باقی سامان اتروا کر لا رہا تھا۔

’’سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی‘‘ اس کے شوہر فرقان نے پوچھا۔

’’سفر میں تو Suffer کرنا ہی پڑتا ہے ۔ اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

’’ ارے واہ ٹھیک ہو ۔ یعنی سفر آرام سے گذرا ۔ عمران اسٹیشن پہنچ گیا تھا نا؟‘‘

"نہیں ممی راستے میں ہی مل گئی تھیں۔" عمران سامان لے کر اندر داخل ہو رہا تھا۔

"اچھا شرارت سے باز نہیں آؤ گے۔" فرقان نے پیار سے جھڑکا۔

"پھر پاپا آپ بھی تو ایسی بات کرتے ہیں۔ بھلا میں بھی کبھی بے وقت ہوا ہوں۔"

"یہ کیا تمام پھیلا رکھا ہے۔کیا نصیبن نہیں آتی تھی"۔؟ چاند نے پوچھا۔

"آتی تھی، آتی ہے، آتی رہے گی۔لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوتا کہ ایک ماہ تک ہم لوگ کس قدر لاوارث سی زندگی گذار رہے تھے۔"۔فرقان نے جواب دیا۔

"اے خدا نہ کرے! بیٹا عمران تم بھی ہاتھ پیر نہیں ہلا سکتے تھے"

"ممی پاپا کی تعلیم کا خیال رکھنا پڑتا ہے"

دراصل چاند اپنے بھائی کے یہاں لکھنؤ گئی ہوئی تھیں اور ایک ماہ بعد پلٹ کر آئی تھیں۔ہاتھ منھ دھو کر چائے پینے کے بعد انہوں نے کمرہ درست کرنا شروع کیا۔تو صفائی کرتے وقت ایک جوڑی بوسیدہ بے رنگ سی زنانی چپلیں دکھائی دیں یہ تو ان کی نہیں تھیں۔عمران و فرقان اس وقت لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔شاید نصیبن کی ہوں گی۔انہوں نے چپلیں پیر سے ایک طرف کھسکا دیں۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔چپلیں بار بار نظروں کے سامنے آتی رہیں۔لیکن

عجیب اتفاق کہ وہ نصیبن سے پوچھنا ہی بھول جاتیں۔

ایک دن نصیبن کچھ اٹھا رہی تھی تو اس کے پیر کی ٹھوکر سے چپلیں ادھر ادھر بکھر گئیں۔تو چاند کی توجہ ادھر ہوئی۔

"ارے نصیبن اپنی چپلیں کیوں لڑھکا رہی ہے۔گھر کیوں نہیں لے جاتی؟"،انہوں نے ٹوکا۔

"کون سی چپل بی بی جی؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ارے یہی جنھیں ٹھوکروں سے لڑھکا رہی ہے۔"

"یہ تو ہماری چپل نہیں ہے۔"

"پھر کس کی ہیں۔"

"ہم کا جانیں۔ہم تو سمجھے آپ ہی کی ہوں گی۔"

" نہیں یہ میری تو نہیں ہیں۔" پھر کس کی ہو سکتی ہیں؟

"کب سے یہاں دیکھ رہی ہو؟"

"ارے قریب بیس بائیس دن سے۔"

وہ خاموش ہو گئیں۔کس کی چپلیں ہو سکتی ہیں۔اور وہ انہیں یوں چھوڑ کر کیوں گئی۔اسی ادھیڑ بن میں ایک اڑتا سا خیال آیا کہیں میری غیر موجودگی میں فرقان...نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔فرقان ذرا رسیا قسم کے آدمی ہیں۔عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ خوبصورتی کی تعریف بھی کرتے ہیں لیکن ایسی حرکت وہ نہیں کر سکتے۔چھی!!!انھیں اپنے اس خیال سے گھن آئی اور سر سے جھٹکنے کی کوشش کی یہ

اور بات تھی کہ یہ خیال اور سختی سے دل میں بیٹھتا جا رہا تھا۔

شام کو فرقان جب دفتر سے واپس آئے تو چاند کچھ خاموش سی تھیں۔

''کیا بات ہے؟ آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟،،

انھوں نے پوچھا۔

''نہیں تو!'' چاند کچھ جھجھک سی گئیں۔

'' کچھ سست لگ رہی ہو''

''تھوڑی سی تھکان ہوگئی ہے''

''بھئی اتنا کام نہ کیا کرو کہ میرا بوجھ نہ اٹھا سکو'' یہ مذاق چاند کو اچھا نہ لگا

چائے پیتے وقت چاند سے برداشت نہ ہوا ''وہ چپلیں کس کی رکھی ہوئی ہیں؟،،

''کہاں؟

''بیڈ کے نیچے''

'کس کی ہیں؟'

''یہی تو میں پوچھ رہی ہوں''

''تمہاری نہیں ہیں''

''نہیں''

''تو پھر چپلوں کے ساتھ آئے پیر بھی کہیں ہوں گے۔،،انھوں نے اتنی

12152

سادگی سے کہا کہ چاند کچھ نہ سمجھ سکیں۔

''کیا مطلب؟''

''ارے بھئی چپلیں کسی اور کی ہیں تو پیر بھی کہیں رکھے ہوں گے۔ بھلا کوئی شریف انسان آئے گا پیر واپس لے جائے گا۔ اور چپلیں یہیں چھوڑ جائے گا۔ اور میرے پاس تو شریف لوگ ہی آتے ہیں۔''

''چپلیں زنانی ہیں''

''کیا مطلب؟'' اب فرقان کے چونکنے کی باری تھی۔

''ہاں چپلیں زنانی ہیں''

''تب تو مسئلہ صاف ہے''

''کیسے؟''

''ارے بھئی تمہاری کوئی سہیلی آئی ہوں گی اور تمہاری چپلیں پہن کر چلی گئی ہوں گی۔''

''جی چپلیں بہت معمولی سی ہیں۔ دھوبن تو نہیں آئی تھی؟''

خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی۔ اب فرقان کے سارے حواس متحرک ہو گئے اور ایک گھبراہٹ بھی طاری ہوگئی۔ دھوبن قبول صورت اور بہت غمزہ وہ ادا والی تھی اور فرقان اس سے میٹھے انداز میں چھیڑ چھاڑ بھی کرتے تھے۔ دھوبن بھی اکثر چھوئی موئی ہو جاتی تھی۔ بظاہر تو بات مذاق میں شمار ہوتی تھی لیکن فرقان کو لگا کہ چاند نے ان کی چوری پکڑ لی ہے۔ دھوبن تو آئی تھی۔ گھبراہٹ میں انھیں کچھ

نہ سوجھا۔

''کیا چپّل چپّل کی رٹ لگا رکھی ہے میں کیا جانوں دھوبن کو تم ہی منع کر گئی تھیں کہ ایک ماہ تک نہ آئے۔''

چاند کو یاد آیا۔ بات تو صحیح تھی۔

''ارے میں تو صرف اس لئے پوچھ رہی تھی کہ آئی ہو اور چپلیں چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ ان لوگوں ننگے پیر آنے جانے میں کہاں برا لگتا ہے۔'' چاند نے بات برابر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تیر تو نکل چکا تھا۔

رات کو سوتے وقت پھر چپلوں پر نظر پڑی تو چاند کے منھ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''نہ جانے کس کی چپلیں ہیں۔''

''ارے یہ چپلیں تو بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں میں تو سمجھا تھا کہ تمہاری ہیں

''ایسی رڈی''

''ارے بھئی دل ہی تو ہے کیا پتہ کیا پسند آجائے؟''

''تمہارے جیسا تو ہرگز نہیں ہے''

'' چھوڑو یار چپلیں بار بار بیچ میں کہاں سے آجاتی ہیں۔ اس گھر میں میں ہی اکیلا مرد تو نہیں ہوں۔'' وہ صلح کن انداز میں بولے۔

ہاں ہو سکتا ہے انہوں نے سوچا ہو سکتا ہے کوئی عمران کی دوست ...نہیں دوست کی چپّل تو ایسی نہیں ہو سکتی پھر.....پھر.....

ادھر فرقان پریشان ہو گئے۔

کم بخت جانے کون یہ چپلیں چھوڑ گیا ہے اور کیوں میں نے نہ دیکھا ہوسکتا ہے یہ رام کلی کی ہی ہو۔

اس دن اتوار تھا۔عمران اپنے دوست کے گھر گیا ہوا تھا۔صبح ان لوگوں کا ناشتہ نصیبنُ ہی بنا گئی تھی۔جب سے چاند گئی تھیں وہ ناشتہ ضرور تیار کر دیتی تھی اور اگر موقع رہتا تو کبھی کبھی شام کا کھانا بھی پکا دیتی۔عمران نے کہا تھا کہ لوٹتے ہوئے ہوٹل سے کھانا لیتا آئیگا۔فرقان اخبار پڑھ رہے تھے۔کہ دروازے کی گھنٹی بجی یہ ان کے دفتر کی چپراسی رام کلی تھی۔وہ صاحب پر کچھ زیادہ مہربان تھی۔کبھی کبھی گھر آ جاتی تھی۔چاندا کثر اس سے چھوٹے موٹے کام کروالیتی تھیں۔اسے معلوم نہ تھا کہ چاند گھر پر نہیں تھیں۔لیکن چاند کے نہ ہونے سے اسے ہچکچاہٹ سے زیادہ خوشی ہی ہوئی۔پھر وہ صاحب کے پیر دبانے لگی۔بات شاید آگے بڑھتی لیکن عمران آ گیا تھا اس لئے وہ گھر کے بچے کھچے برتن دھو کر اپنے گھر چلی گئی تھی پتہ نہیں وہی اپنی چپلیں چھوڑ کر گئی ہو۔

ابھی پچھلے اتوار کو دھوبن آ دھمکی۔عمران انڈے لینے باہر گیا۔اس سے میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی تھیں کہ عمران آ گیا۔اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ پتہ نہیں کیوں؟

دوسرے دن صبح چاند نے عمران سے پوچھا ”بیٹا تمہاری کسی دوست کی چپلیں تو نہیں رہ گئیں۔“

''کیسی چپلیں ممی؟ عمران کچھ سمجھا نہیں۔

''ایک جوڑی چپّل گھر میں پڑی ہوئی ہیں میری تو ہیں نہیں۔ نصیبن کی بھی نہیں ہیں شاید تمہاری کسی دوست کی ہوں''

''اب ممی میری کوئی دوست ننگے پیر تو گھر نہیں جائے گی''

یہ بات انہیں کیوں نہ سمجھ آئی۔ بات تو صحیح کہہ رہا ہے چپلیں بھی ٹوٹی ہوئی ہیں اور کم قیمت کی ہیں۔ تو یہ کس کی ہیں پتہ نہیں وہ عمران کی وجہ سے گھر میں ہیں یا فرقان کی وجہ سے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھیں اور حل بھی نہیں نکل رہا تھا۔ پتہ نہیں ان کے پیچھے.........

شام کو نصیبن آئی تو اس کے ساتھ اس کی پڑوسن بھی تھی۔ وہ کبھی کبھی آجاتی تھی۔ آج نصیبن کی طبیعت پھر خراب تھی وہ اس کی مدد کرنے کے لئے ساتھ آگئی تھی۔ کام کرنے کے بعد چائے بنائی۔ چاند بیڈ پر ہی بیٹھی تھیں۔ ان کو چائے دی اور دونوں زمین پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔

''ہم اسے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پریشان ہورہے تھے اور چھوڑ کر چلے گئے تھے یہاں''

''کیا چیز رشیدہ؟''

ارے یہی چپّل اودن آپ ہم کو اپنی چپّل دہن رہیں ہم او کو پہن کے اسے یہیں بھول گئے اور کب سے گھر میں ڈھونڈ رہے ہیں۔''

آج چاند کو بھی یاد آیا اور تیر جگر کے پار ہو گیا۔

ناول

رفیعہ ابھی تک کچن میں تھی ۔ میں دیر سے بچے کو سنبھالے تھا ۔ میرا ابھی دفتر جانے کا وقت ہو رہا تھا اور رفیعہ کو بھی اسکول جانا تھا ۔ مجھے شیو بھی کرنا تھا ۔ میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ چلو اچھا ہے کہ سسرال بھی اسی شہر میں ہے ۔جس سے اتنی آسانی تو ہے کہ جب رفیعہ اسکول پڑھانے جاتی ہے تو بچے کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ دیتی ہے ورنہ بچہ سنبھالنے کے لئے بھی ایک نوکرانی کی ضرورت پڑتی اور ضرورتیں کیا کیا نہیں پڑتی ہیں ۔ میں نے بھی کیا کیا سوچا تھا بی اے کرنے کے بعد کوئی اچھی سروس کرلوں گا اور تعلیم جاری رکھوں گا ۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے بڑا آدمی بن جاؤں گا ۔ کار ہوگی ، بنگلہ ہوگا ، دو چار نوکر ہوں گے ۔ کسی بڑے گھر میں میری شادی ہوگی ادب سے میرا لگاؤ پہلے سے ہی تھا ۔ یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ کبھی ادب کا دائرہ نہیں چھوڑوں گا ۔ ضرور کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گا اور عمر کا آخری پڑاؤ بھی اچھا گذرے گا ۔ لیکن زندگی کی حقیقتوں سے سابقہ پڑا تو سب کچھ بھول گیا ۔ صرف زندہ رہنے کی ضرورتیں یاد رہیں ۔ آج تک وہ سارے تصورات باقیاتِ ماضی بن کر کچوکے لگاتے ہیں ۔

میں ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوا تھا بی۔اے کرتے وقت کان میں اکثر یہ صدا جاتی رہی کہ کسی طرح مسیّب (میں) پڑھ لکھ لے اور نوکری ہو جائے تو ہمارے بھی کچھ دن پھریں۔

ہم دو بھائی اور تین بہن تھے صبح ہم سب چائے پیتے پھر پانچ پراٹھے بنتے جن میں سے دو ابا کے لئے دو میرے لئے ایک سب سے چھوٹے بھائی ضیا کے لئے ہوتے۔چائے ضرور دوبارہ بن جاتی۔ماں اور بہن رات کی بچی کھچی روٹیاں کھا کر صبر شکر سے بیٹھ جاتیں۔پھر رات کا کھانا ہی ہم لوگ کھاتے ابا ایک دوکان پر کام کرتے تھے۔اس کا احساس مجھے بھی تھا کہ ہم بہت معمولی لوگ ہیں لیکن سوچتا تھا بی۔اے کر کے میں خوب کمانے لگوں گا اور بہت سے خواب بُن ڈالے۔ویسے تو میں نے اپنے والدین کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دی انھوں نے جو دیا وہ کھایا اور جو پہنایا وہ پہنا۔لیکن نوکری کے خیال کے ساتھ ایک خوبصورت خوشحالی کا احساس جڑا ہوا تھا۔آج وہی تصوّرات کانٹے بن کر اکثر چبھتے رہتے ہیں۔میرے والدین اپنی حیثیت سے زیادہ کرتے تھے۔بی۔اے کرنے کے بعد میں نے خود سروس کرنا طے کیا تا کہ ابا کا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ مجھے باقی بوجھ بھی اٹھانا ہوگا۔سیکڑوں عرضیوں Writen Test اور انٹرویوز کے بعد جب میں بکھرنے سا لگا تو مجھے ایک ہزار کی ایک معمولی سی نوکری مل گئی۔میں نے ایم۔اے پرائیویٹ کرنا چاہا۔اسی سال مجھ سے چھوٹی بہن شاہدہ کی شادی ہونا طے ہوئی اور میرے پاس جو بھی بچے کھچے روپئے تھے وہ

شادی میں صرف ہو گئے۔ دوسرے سال ابا عمر کی وجہ سے کام سے ہٹا دیئے گئے
۔ایک سب سے بڑا دھچکا تھا۔اب ساری ذمہ داری مجھے نبھانی تھی۔ میرا دل
اچاٹ سا ہو گیا۔ پڑھنے کا وقت نہیں، فیس میں پیسے لگا دوں تو کئی کام رک جاتے
تھے۔ دوسری بہن شبانہ کی شادی بھی طے ہو گئی۔ کچھ ابا کے بچائے پیسے کچھ اماں
کے زیور جیسے تیسے اس شادی کو نبٹایا تیسری بہن آشیانہ بھی شادی کے قابل تھی
ایک رشتہ آیا ادلے بدلے کی شادی چاہتے تھے میری نہ کوئی پسند تھی نہ کوئی
Affair بس میں شادی تب کرنا چاہتا تھا جب میں ایم۔اے کر لوں لیکن ادھر
سے بھی جلدی اور اماں بھی اب بہو گھر لانا چاہتی تھیں۔ بہر حال شادی ہو گئی۔

رفیعہ اچھی صورت شکل کی تھی اور انٹر پاس بھی تھی۔ میں خوش تھا۔ پھر
مجھے ایک راہ سوجھی کہ کیوں نہ رفیعہ بھی نوکری کر لے ایک سال ٹریننگ اور
دو سال کی بھاگ دوڑ کے بعد اسے بھی نوکری مل گئی لیکن اس شہر میں جہاں اس کا
میکہ تھا میرا ایک بچہ رضوان دو سال کا ہو چکا تھا میرا چھوٹا بھائی بھی میری ہی ذمہ
داری تھا۔اس نے ہائی اسکول کر لیا تھا کہ اچانک ابا ایک رات جو سوئے تو پھر
اٹھے ہی نہیں اماں کا حال برا تھا سال بھر ان کو سنبھلنے میں لگے میں عجیب کشمکش میں
تھا۔ میں اپنے بیوی بچوں سے دور تھا۔ میرا Transfer ہو سکتا تھا اور میں
کروانے کی سوچ بھی رہا تھا اماں اور ابا بھی چاہتے تھے کہ بہو اپنے گھر میں رہے
لیکن ان لگاتار حادثوں سے میں بھی پریشان تھا۔ پھر جب ضیا یونیورسٹی جانے لگا
تو اماں اور ضیاء کے کہنے پر یہاں آ گیا اب میرا دوسرا بچہ آٹھ ماہ کا ہے رضوان

اسکول جانے لگا ہے اور فرسٹ اسٹینڈرڈ میں ہے۔

رفیعہ نے ناشتہ لگا دیا تھا میں نے شایان کو اسے دیا اور خود جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتہ کر کے ٹفن اٹھایا اور آفس کو چل دیا۔

بس میں ہمیشہ کی طرح بہت بھیڑ تھی میں جن صاحب کے بغل میں کھڑا تھا کچھ مگن اور گنگناتے ہوئے لگے۔ ابھی نو جوان تھے۔ چونکہ مجھے زندگی نے کبھی گنگنانے کی فرصت ہی نہیں دی اس لئے میں خوش اور گنگناتے ہوئے لوگوں کو ضرور دیکھتا ہوں وہ شخص مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر مسکرا دیا ایک لمحہ کو میں جھجک گیا پھر میں نے ہمت سے کہا ''معاف کیجئے گا مجھے تو فرصت ملتی نہیں لیکن خوش و خرم لوگوں کو دیکھ کر میں بھی ذرا خوش ہو لیتا ہوں''۔

''اچھی بات ہے کہ آپ نے خوش ہونے کا طریقہ سمجھ لیا اصل چیز خوشی ہے جیسے بھی ملے''

''جی ہاں درست فرمایا لیکن آپ زیادہ فائدے میں ہیں کہ آپ خود خوش ہیں مسٹر؟''

'' میرا نام روپیش گپتا ہے بی۔ اے کر چکا ہوں ایم۔ اے کا طالب علم ہوں ادبیات میں سب سے زیادہ دلچسپی ہے۔'' میں ایک دم چونک پڑا۔ ادبیات میں دلچسپی بی۔ اے پاس، ایم۔ اے کا طالب علم کہیں میرے چہرے سے تو روپیش نے نہیں پڑھ لیا۔

''جی مجھے مسیّب راہی کہتے ہیں۔ میری اور آپ کی پسند بہت کچھ ملتی جلتی

ہے"۔

روپیش نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور ہم باتیں کرنے لگے ادب کی اہمیت کی باتیں دنیا کی گھما گھمی کی باتیں اس نے میرے دفتر کا پتہ لے لیا تھا۔ اس نے مجھ سے بتایا کہ وہ ایک اچھے بزنس مین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ گاڑی خراب ہوگئی ہے اس لئے بس سے جارہا ہے۔

اس سے دوسری ملاقات میرے دفتر میں ہوئی اس نے بتایا کہ پاپا کے بزنس کے سلسلے میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا کہ مجھ سے ملتا چلے۔ پھر اس نے یہ بھی کہا کہ وہ شام کو ادھر سے کار سے گزرے گا تو مجھے بھی Pickup کر لے گا۔

پھر کہیں کافی پئیں گے اور مجھے چھوڑ دے گا اس طرح وہ میرا گھر بھی دیکھ لے گا۔

شام کو جب میں دفتر سے نکلا تو یہ سوچ کر کہ باہر روپیش کار میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ لیکن مجھے کوئی کار نہیں دکھائی دی۔ کہیں قریب سے آواز آئی۔

"آپ اس طرف آجائیں روپیش آپ کا انتظار کر رہا ہے" میں نے مڑ کر دیکھا کچھ دور پر روپیش کھڑا تھا۔

"دراصل میری کار بگڑ گئی ہے۔ لیکن آپ سے وعدہ کیا تھا اس لئے حاضر ہوں۔ آیئے کافی ہاؤس میں بیٹھ کر کافی بھی پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں" کافی ہاؤس میں بیرا جب آرڈر لینے آیا تب اس نے مجھ پر آرڈر کی ذمہ داری ڈال دی میں

نے تکلفاً دو کافی کا آرڈر دیا۔ وہ اپنے پاپا کے بزنس کے بارے میں بتا رہا کہ کبھی اسے کلکتہ، کبھی بمبئی اور کبھی دلی جانا پڑتا ہے اس سے وہ بہت Disturb ہو جاتا ہے کہ اس کی پڑھائی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

''مسیّب جی Litterature میری زندگی ہے۔ اور اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے بزنس۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ اسی چکر میں زندگی گزرتی ہے پاپا اس بات کو سمجھتے نہیں کسی طرح ماسٹرس کی ڈگری حاصل کرلوں پھر میں عملاً ادب تخلیق کرنے کے میدان میں آجاؤں گا حالانکہ زمانے کا یہ چلن بالکل غلط ہے کہ ڈگریوں سے کسی کی قابلیت کا اندازہ لگایا جائے لیکن زمانے کے منھ پر اگر تھپڑ مارنا ہی ہے تو اسی کے اصولوں سے ماریئے تا کہ وہ آپ پر انگلی نہ اٹھا سکے۔''

ہم کافی پی چکے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ رفیعہ پریشان ہو رہی ہوگی اسے کھانا بھی پکانا ہوگا۔ میں نے رسماً بیرے سے بل پوچھا مجھے پوری امید تھی کہ وہ فوراً میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دے گا اور پرس کھولے گا اور بل چکا دے گا۔ لیکن وہ کہیں گم تھا پیسے نکالنے لگا تو وہ چونکا۔ اس نے واقعی پرس نکالا لیکن میں نے تکلفاً کہا کہ '' رہنے دیجئے روپیش جی میں پیسے دے چکا ہوں''

''اچھا کوئی بات نہیں میں تکلف میں یقین نہیں رکھتا''

اس رات میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ میری انا کی تکمیل شاید اسی روپیش کی شکل میں ہوگی۔ جو میں سوچتا تھا وہ اس نے حاصل کرلیا۔ اس میں مجھے

اپنی کچلی ہوئی شخصیت ابھرتی نظر آئی۔ میں اس کی طرف کھنچتا گیا۔ اکثر ملتا تھا۔ کبھی کبھی میرے گھر آجاتا تھا۔ میرا گھر ذرا گلیوں میں تھا افسوس بھی ہوتا اور خوشی بھی کہ مجھ سے ملنے کے لئے گلیوں میں بھی آجاتا ہے جہاں گاڑی کیا دو سائیکلیں بھی آسانی سے نہ گزر سکیں وہاں اس کی کار کیا آسکتی پھر بھی کتنا منکسر المزاج ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے لگا یہ وہی روپ ہے جو میرا ہوتا، اگر اس طرح حالات سے کچل نہ جاتا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایک ناول لکھ رہا ہے اس کا مسودہ قریب قریب مکمل ہے۔

"اور جب وہ منظر عام پر آئے گا تو میبّ صاحب ادب میں تہلکہ مچ جائیگا میں اپنی ذمہ داریوں میں اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ اس کے گھر نہ جاسکا۔ پتہ تو اس نے پہلے دن جب ملا تھا تبھی بتایا تھا وہ میرے ذہن میں موجود نہ تھا۔ لیکن اس نے بھی پھر کبھی مجھے گھر آنے کی دعوت نہیں دی مجھے بھی لگا بزنس کی مصروفیات ہوں گی۔ لیکن ایک بات ضرور تھی کافی ہاؤس کا بل آتا تو وہ تکلف کو بیچ میں نہ آنے دیتا اور میں ہمیشہ تکلف کو گھسیٹ لاتا۔

ایک اتوار کو میں ڈائیری میں کچھ تلاش کر رہا تھا تو ایک جگہ روپیش کا پتہ نوٹ تھا۔ اب مجھے حیرت تھی کہ یہ تو ایک معمولی سے محلے کا پتہ تھا۔ ایک بڑا بزنس مین ایسے محلے میں؟ یوں تو اتوار کو رفیعہ کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کرتا تھا لیکن میری ساس کی طبیعت خراب تھی رفیعہ دد دونوں سے وہیں تھی۔ میں بھی وہیں جا کر کھانا وغیرہ کھالیتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا کیوں نہ آج روپیش

کے گھر چلوں۔اس محلے میں کچے پکے ٹوٹے ہر طرح کے مکان تھے۔روپیش کے پتے پر جب رکا تو سامنے ٹوٹا ہوا پختہ مکان تھا سامنے کے کمرے میں گہرے رنگ کے پرانے اور موٹے پردے پڑے تھے۔دستک دینے پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون باہر آئیں میں نے بتایا کہ میں روپیش کا دوست ہوں اور اس سے ملنے آیا ہوں تو انہوں نے کمرے میں آنے کو کہا اور بتایا کہ روپیش ابھی تو نہیں ہے۔ایک آدھ گھنٹے میں آجائے گا۔میں تب تک اس کا انتظار کرلوں۔

کمرے کی دیواریں شکستہ تھیں۔میں حیرت میں تھا۔سامنے ایک پرانی میز تھی۔میز پر کافی موٹی سی فائیل رکھی تھی۔مجھے لگا یہ اسی ناول کا مسودہ ہوگا یوں تو میں کسی کی چیز بغیر اس کی اجازت کے نہیں چھوتا لیکن کہانا جو چیز میں نہیں کر پایا مجھے وہ روپیش میں نظر آتی تھیں۔میں نے فائیل اٹھالی اور ورق گردانی شروع کردی۔

ایک ورق۔دوسرا تیسرا چوتھا پانچواں جانے کتنے اوراق لیکن ہر ورق ایک عرضی تھی جو مختلف سرکاری و پرائیوٹ فرموں و کمپنیوں کے منیجروں کے نام تھی اور ہر ایک عرضی دینے والے کا نام روپیش کمار گیتابی۔اے درج تھا۔

یہ سچ ہے؟

یہ گفتگو فون پر ہو رہی ہے ۔ایک لڑکی نے ایک بدتمیز لڑکے کی بیچ چوراہے پر پٹائی کردی ۔لڑکے نے اس پر حملہ کیا تھا۔ پٹنے کے بعد بھی وہ حملے کی کوشش کرتا رہا۔ پولس بھی آئی لڑکے کو مارا بھی لیکن ساتھ میں ایک بات تھانے کے ایک داروغہ نے کہی ''لڑکیاں بھی تو اپنے کو دکھاتی پھرتی ہیں'' ۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے۔لڑکی نے گھر میں یہ بات اپنی ماں سے بتائی ۔

اس خاتون کی گفتگو اس داروغہ سے یوں ہوئی ۔

خاتون:۔ ہلو! آپ داروغہ جی ہیں ۔

داروغہ:۔ ہاں!

خاتون:۔آج آپ کے علاقے میں ایک لڑکے نے ایک لڑکی کے ساتھ بدتمیزی کی اور جان لیوا حملہ بھی کیا؟

داروغہ:۔ یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟

خاتون:۔ میں اسی لڑکی کی ماں ہوں ۔

داروغہ:۔ ہاں ! ہاں ! دیکھئے ہم لوگ بھی پریوارک لوگ ہیں لڑکے کی

کافی پٹائی ہوئی۔لیکن کیا ہے کہ لڑکیاں آج کل اپنے کولڑکیاں نہیں سمجھتیں۔

خاتون:۔ جی اس سے آپ کیا مطلب ہے کہ لڑکیاں آج کل اپنے کو لڑکیاں نہیں سمجھتیں؟ تو پھر کیا سمجھتیں ہیں؟

داروغہ: اب دیکھئے اگر کوئی لڑکا کچھ کرتا ہے تو ذراہٹ بچ لینا چاہئے مارنے پیٹنے کی ضرورت کیا ہے۔؟

خاتون:۔ یعنی اگر لڑکی یا عورت ہے تو اسے ہر لڑکے اور مرد کی بدتمیزی برداشت کرنی چاہئے اگر بدتمیزی پر احتجاج کرے پھر لڑکی نہیں۔

داروغہ:۔ میرا مطلب تھا نارمل کپڑے پہنے ہوتی تو کوئی بات نہ ہوتی۔

خاتون:۔ یعنی اگر وہ جینس اور شرٹ پہنے ہے تو نارمل کپڑے نہیں ہیں۔اور بے چارہ مرد یا لڑکا کیا کرے وہ چھیڑ چھاڑ اگر کرتا ہے تو اس کا پیدائشی حق ہے۔اور اگر غلطی سے اپنی ماں یا بہن کو عریاں دیکھ لے تو اس کا حق بنتا ہے کہ اس پر جنسی حملہ کر بیٹھے۔

داروغہ:۔ ارے آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ بھلا ماں بہن پر ایسا کیوں کرے گا۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔

خاتون:۔ یعنی مرد کو صرف اتنا دماغ ٹھیک رکھنا چاہئے۔باقی عورتوں کے معاملے میں اسے پورا حق ہے کہ اسے ذلیل کرے۔

داروغہ:۔ باقی عورتیں کیوں؟ جو مریادا کے اندر رہیں گی ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوگا۔

خاتون:۔ تو کپڑوں کی مریادا کیا ہے؟

داروغہ:۔ شلوار کرتا یا ساڑی۔

خاتون:۔ ساڑی کیوں؟ ساڑی میں پیٹ اور پیٹھ نہیں دکھائی دیتی؟

داروغہ:۔ اسے لڑکے ایسے تھوڑی دیکھیں گے۔

خاتون:۔ اور جو آج صبح اخبار میں تھا کہ ٹرین کی ایک بوگی میں دو عورتوں کو جو اپنے شوہروں کے ساتھ جا رہی تھیں۔ انھیں کھینچ کر اندر گھسیٹ لیا گیا اور ان کے شوہروں کو باہر پھینک دیا گیا کیا آپ نے یہ انکوائیری کر لی ہے کہ وہ دونوں عورتیں بھی جینس اور شرٹ پہنے ہوئے تھیں۔

داروغہ:۔ آپ تو بلا وجہ بات کو موڑ رہی ہیں۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہوئی ہوگی۔

خاتون:۔ یقیناً عورتیں قصوروار رہی ہوں گی۔ ہوسکتا ہے وہ خوبصورت رہی ہوں گی۔ مرد تو کبھی قصوروار نہیں ہوتا۔ کب تک آپ اپنی بدکرداری کا دوش عورتوں پر مڑھتے رہیں گے۔

داروغہ:۔ دیکھئے آپ بلا وجہ گرم ہو رہی ہیں۔

خاتون:۔ اور وہ جو نابالغ چھوٹی بچیوں کے ساتھ بلاتکار ہوتا ہے۔ یقیناً ان معصوموں کا قصور ہوتا ہوگا کہ کیوں مردوں کو نظر آجاتی ہیں۔

داروغہ:۔ دیکھئے آپ بات کو بگاڑ رہی ہیں۔

خاتون:۔ نہیں میں آپ کو صرف سچائیاں بتا رہی ہوں کہ مرد اپنے بیمار

دماغ کا علاج نہیں کرنا چاہتا۔آپ جو مدد بھی کرتے ہیں تو یہ کہنے سے نہیں چوکتے کہ قصور عورت کا ہی ہے۔کیا آپ چوروں کے پکڑنے کے بعد بھی جس کے یہاں چوری ہوئی ہے۔اس کو قصوروار ٹھہرائیں گے کہ تم نے مال گھر میں رکھا ہی کیوں؟ دکانوں سے کوئی سامان لوٹے تو آپ یہی کہے گے کہ سامان سامنے رہے گا تو لوگ لوٹیں گے ہی اور اگر ایسا نہیں ہے تو عورت کے ساتھ غلط ہونے پر عورت کو ہی کیوں قصوروار ٹھہراتے ہیں؟

داروغہ:۔ دیکھئے وہ کوئی اچھے گھر کا لڑکا لگ رہا تھا۔اس نے بلاوجہ تو ایسا نہیں کیا ہوگا۔

خاتون:۔ بالکل نہیں ۔وہ بلاوجہ کچھ نہیں کرے گا۔لیکن لڑکی کے ساتھ بلاوجہ ضرور کرے گا کیونکہ آپ جیسے لوگ اسے نہیں لڑکی کو قصوروار ٹھہرائیں گے ۔اور جناب ایک بات اور یورپ میں جہاں عورتیں اپنا پورا جسم نہیں ڈھکتیں وہاں راہ چلتے تو جنسی حملے نہیں ہوتے کیوں۔؟

داروغہ:۔ دیکھئے وہاں کی اور بات ہے۔

خاتون:۔ جی ہاں اور ہے۔وہاں بھی جرم ہے لیکن وہاں جرم کرنے والا مجرم مانا جاتا ہے۔جو شکار ہوتا ہے وہ نہیں۔اور آپ لوگ بھی اب جانوروں کی حدوں سے نکل کر تہذیب یافتہ ہو جایئے۔یوں تہذیب کی جھوٹی دہائی دیکر بیجا جواز مت پیش کیجئے۔

اتنا کہہ کر خاتون نے فون کاٹ دیا۔

لکیریں

مجھے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ عشق کے انداز کیا ہوتے ہیں۔ کبھی عجیب سے مثلث ہوتے ہیں۔ کبھی ایک کے پیچھے دوسرا۔ دوسرے کے پیچھے تیسرا اور And So- On.... کبھی کوئی شخص عجیب انداز میں سب کا منظورِ نظر بنتا ہے کہ اکثر عجیب شکلیں تیار ہوتی ہیں بنتی ہیں۔ بگڑتی ہیں۔ ٹوٹتی ہیں، جڑتی ہیں۔ ایک چیز کا بننا اور بگڑنا تو سمجھ میں آتا ہے پر اگر زاویے اور لائنیں بار بار ٹکرائیں تو کبھی زندگی مصیبت بن جاتی ہیں۔ اور کبھی آسان ہو جاتی ہیں۔ جو نہ ساری عمر آنسو بہاتی ہے اور نہ ساری عمر کھلکھلاتی ہے۔

میری مسز صدیقی سے پہچان اس وقت ہوئی جب میں اپنی بیٹی رومی کی کلاس ٹیچر سے ملنے گئی۔ وہ کوئی اور نہیں مسز صدیقی تھیں۔ دبلی پتلی اور درمیانہ قد گندمی رنگت اور آہستہ آہستہ بولنے والی شخصیت ایک لمحہ کو ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کچھ تھا ہمارے بیچ۔ کیا؟ کبھی کبھی دو انجان لوگ بھی کس قدر قریب ہوتے ہیں اور کبھی ساتھ زندگی گزارنے والے بھی دو الگ الگ قطب کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ جن میں کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ ہم لوگوں میں کافی دوستی

ہو گئی۔ گھر بھی آنا جانا ہو گیا۔ کافی اچھے Faimly Terms ہو گئے۔

اس روز بھی ہم مسز صدیقی کے گھر چائے پی رہے تھے۔

مسز صدیقی نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر صدیقی کے دفتر میں بہت کام رہتا ہے اس لئے وہ عام طور پر آٹھ بجے کے بعد آتے ہیں۔ میرا طلاق ہوئے دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ کبھی میری بیٹی مسز صدیقی ساتھ ہی اسکول سے گھر آجاتی اور میں آفس سے وہیں پہنچ جاتی ہوں۔ ان کا ایک سات سال کا بیٹا ہے شہاب۔

جانے کیوں مجھے اکثر محسوس ہوتا رہا کہ کچھ ضرور ہے جو اس Faimly میں Normal نہیں ہے۔ کیا؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا میری مسٹر صدیقی سے ان کے بچے کی Birthday party میں دو بار ملاقات ہوئی میں طلاق شدہ ہوں اور ایک بیٹی کی ماں بھی اس لئے زیادہ تر میں جلدی گھر پہنچنا چاہتی تھی کہ ہم اکیلی عورتیں مردوں کی نظروں میں شکار کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ بہر حال اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ مجھے شادی کے بعد تین سال کے عرصے میں بڑے تلخ تجربوں سے گزرنا پڑا۔ کبھی میری معمولی شکل وصورت پر طنز کی بوچھار ہوتی تو کبھی میری نوکری پر۔ کھانا پکانے میں ماہر نہ سہی لیکن گرہستی چلانے لائق اچھا خاصہ پکا لیتی تھی۔ لیکن چونکہ میں نوکری کرتی تھی۔ تو ذرا بھی مرچ نمک کا توازن گڑبڑایا نہیں کہ اتنی لعنتیں پڑتیں کہ پوچھئے مت۔

"گرہستی چلانا آسان ہوتا ہے کیا؟ جو عورت کھانا پکانا ہی نہ جانتی ہو وہ

گھر کیا چلائے گی۔ باہر گھومنا تو سب کو آتا ہے۔،، میری ساس کہتیں وہ مجھے احساس کرانا چاہتی تھیں کہ میری نوکری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک قسم کی آوارہ گردی ہے۔

''آپ بھی تو اماں کیا چن کر بہو لائی ہیں۔ زندگی بھر تو مجھے جھیلنا ہے''

میرے شوہر نصرت کیوں پیچھے رہتے حالانکہ میں جانتی تھی کہ ان لوگوں نے سوچ سمجھ کر نوکری پیشہ بہو چنی تھی۔ میرے شوہر بھی معمولی کلرک ہی تھے۔ میرے سسر کافی بوڑھے۔ یہ ان کی دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی سے اولاد ہی نہیں ہوئی۔ اور ان کے انتقال کے بعد دوسری شادی ہوئی تو چھ بچوں کی ذمہ داری آپڑی۔ میرے سسر کی سرکاری نوکری نہیں تھی تو ان سے معاشی طور پر اب کوئی فائدہ بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی وہ دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ چار بہنوں میں دو کی شادی ہو چکی تھی اور دو کی باقی تھی۔ ایک نند وصیہ ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اور بہ مشکل پانچ سو ملتے تھے۔ میں اس وقت ایک سرکاری دفتر میں Legal Assistnt تھی۔ خاصی تنخواہ تھی لیکن شاید ان لوگوں کو اسی بات کا ڈر تھا کہ کہیں میں ان پر حاوی نہ ہو جاؤں۔ دبا کے رکھنے کا یہ آسان طریقہ تھا کہ بات بات میں احساس کمتری دلایا جائے تا کہ انھیں معاشی فائدہ بھی ہو۔ اور میرے پر نہ نکلنے پائیں۔ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھ سکی تھی۔ سر منڈاتے اولے جو پڑنے لگے تھے پھر عمر بھی کم تھی۔ مجھے سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا کیوں ہے؟ مجھے وہ لوگ نا سمجھ لگتے

تھے۔ یہ ہشیاری تو اب سمجھ میں آتی ہے۔

روز کے طعنوں سے اور نصرت کی بیہودگی میں بہت پریشان رہتی تھی دل چاہتا تھا کہ دفتر دن رات کھلا رہے۔ حد تو تب ہوئی جب میں Pregnent تھی۔ کچھ کھا پی نہیں پاتی تھی۔ اعضا بھی تھکے تھکے رہتے تھے۔ آفس سے آکر اس دن میں لیٹ گئی مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا حالانکہ میں خود سہمی سہمی رہتی تھی۔ طعنوں سے بچنے کے لئے بے انتہا کام کرتی تھی۔ لیکن اس دن اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔

نصرت نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا

''یہ کون سا وقت ہے سونے کا''

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی لیکن چکرا کر بستر پر گر پڑی۔

''یہ کون سا ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ کون سی چال ہے یہ'' اس نے مجھے گھورا۔

پہلی بار ہاں پہلی بار منہ سے جواب نکلا۔

''تمہیں نہیں معلوم مجھے کیا ہوا ہے؟''

بس صاحب۔ کون سی گالی تھی جو نہ سنی ہو دفتر کے ہر مرد سے میرا ناطہ جوڑا گیا۔ اور روز ناٹے دار تھپڑ پھر جو وہ شخص میری نظروں سے گرا تو کبھی عزت نہ پا سکا۔ اور پھر مجھے کچھ ایسی ضد آئی کہ میں نے گھر کے سارے کام چھوڑ دیئے۔ صرف آفس جاتی تو کبھی لوٹتے ہوئے جان بوجھ کر مسز کول کے گھر ایک آدھ

گھنٹہ رک جاتی اس کے لئے کے پہلے یہ سنا۔

''آ گئی حرامزادی! اپنے یار سے چھٹی پا گئی۔ ارے ہمارے نصیب ہی بگڑے تھے کہ ایسی بد کردار لڑکی بیاہ لائے۔ نصرت کا تو مقدر ہی کھوٹا تھا۔ ارے بیٹا تو مت گھبرا میں تری دوسری شادی کروں گی۔ پری بیاہ کر لاؤں گی۔'' اور سعادت مند بیٹا ماں کے پاس بیٹھا گھورتا رہتا اور رات کو نہایت بے دردی سے میرا استعمال کرتا لیکن میرے ہونٹ جو سلے تو کھلے ہی نہیں۔ اور میری نافرمانیاں جو شروع ہوئیں تو پھر بند ہی نہ ہوئیں۔ کئی بار نصرت کو چھپ چھپ کر اپنا تعاقب کرتے دیکھا۔ پیدا ہوئی تو لڑکی میں تو خوش تھی۔ لیکن میری مصیبتیں بڑھ گئیں۔

جب آفس جانے لگی تو ایک دن پلٹ کر آئی تو ماں بیٹے کی سرگوشی کی آواز میرے کانوں تک پہنچ گئی۔ ''دیکھو بات تو چل رہی۔ خدا کرے مان جائیں'' ماں نے کہا۔

''اماں اچھی طرح ان کے دماغ میں نازیہ کی بے ہودگی کی تصویر بٹھاؤ تاکہ کام جلدی بن جائے''۔ بیٹے کا قول تھا۔

''ہاں کوشش تو کر رہی ہوں۔ راضی ہوتے ہی فوراً نکاح کر دوں گی۔''

''اماں ایک بہو سے تو نپٹ نہیں پا رہی ہو۔ کیوں مصیبت دوگنی کر رہی ہو۔'' یہ وصیہ کی آواز تھی۔ وہ کبھی ایسی اسکیموں میں شامل نہیں ہوتی تھی۔ بار بار ان لوگوں کو سمجھاتی بھی تھی۔ نند کے ناطے اس نے مجھ سے بھی کہا تھا۔ بھابھی آپ تو سمجھ دار ہیں۔ کوئی راہ نکالئے کہ آپ کے ساتھ بھی کچھ غلط نہ ہو اور ان کا

رویہ سدھر جائے۔

''مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔اماں اپنی چالاکیوں میں اندھی ہیں بھیا بدعقل کہ بسی بسائی گرہستی اجاڑنا چاہتے ہیں۔،،

اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ان کے ظلم بڑھتے جارہے تھے۔مجھے نہ صبح ناشتہ ملتا تھا نہ رات کا کھانا۔

میرے ناشتہ سے لے کر رات کے کھانے تک کا وقفہ آفس کے آٹھ گھنٹوں تک محدود تھا۔

اس رات میں رات بھر سوچتی رہی صرف سوچتی رہی دوسرے دن آفس سے آدھے دن کی چھٹی لے کر آ گئی۔میں نے یہ وقت اس لئے چنا تھا کہ اس وقت گھر پر مصیبت کی طاقت آدھی سے بھی کم رہتی تھی۔چھوٹی نند فصیحہ اسکول چلی جاتی تھی۔نصرت اپنے دفتر وصیہ کے دل میں میرے لئے نرم گوشے تھے۔صرف ساس سے مورچہ لینا تھا۔سسر بیچارے گھر میں ایک الگ کمرے میں پڑے رہتے تھے۔میری قسمت اچھی تھی کہ ساس گھر پر نہیں تھیں اور میری بیٹی رومی سو رہی تھی۔میں نے اپنے اور رومی کے ضروری کپڑے اور میکے سے ملے وہ زیور جو میرے پاس بچ گئے۔ایک بڑی اٹیچی اور بیگ میں رکھ لئے۔اور رکشہ بلایا میکہ بھی اسی شہر میں تھا اور رومی کو لیکر باہر چل دی۔اچانک آنگن میں وصیہ دکھائی دی۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''جاؤ بھابھی میں تمہیں نہیں روکوں گی۔خدا تمہیں زندگی میں سکون اور

آرام دے پھر بھی دعا کروں گی کہ بھیا اور اماں کو اب بھی عقل آجائے۔ تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن بگڑے گا اب یہ گھر''

دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ سسر کو چھڑی کے سہارے کھڑا دیکھا میں نے سلام کیا۔ تو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہا۔

''خدا حافظ بیٹا سدا خوش رہو'' اور میں دکھی من کے ساتھ اپنے گھر آگئی۔ پھر جو گھر آئی تو واپس گئی ہی نہیں۔ ڈرانے دھمکانے سے لیکر منت سماجت سب ہوئی لیکن بات صرف طلاق پر ختم ہوئی۔ دراصل مجھے ہی ان لوگوں نے صحیح Assess نہیں کیا۔ حالات کے خلاف میرا ردِ عمل مختلف تھا۔

میں نے اپنے تجربے سے صرف یہ جانا کہ شوہر یا تو اچھے ہوتے ہیں یا برے۔ مسز صدیقی کی زندگی کی گہرائیوں میں میں نے کبھی جانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ طلاق کے بعد ان لوگوں نے کبھی رومی سے بھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔

اس شام کو میں مسز صدیقی کے گھر پر ہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی مسز صدیقی نے فون اٹھایا اور کچھ چونک سی گئیں۔

''اوہ تم ہو''

''نہیں گھر پر ہی رہوں گی''

''آجاؤ'' کہکر انھوں نے فون رکھ دیا۔ لیکن کچھ بے چین سی تھیں۔ ہماری دوستی عمر کے اس موڑ پر ہوئی تھی جب بے تکلفی ذرا مشکل سے آتی ہے۔ انسان اتنا کچھ دنیا دیکھ چکا ہوتا ہے اور ذہن میں اتنی پیچیدگیاں آچکی ہوتی

ہیں کہ بچپن کی دوستی کی طرح بے حجاب و بے تکلف رشتہ مشکل سے بن پاتا ہے ۔پھر بھی پوچھ بیٹھی

''کیا بات ہے؟''

انھوں نے اس طرح چونک کر دیکھا جیسے کشمکش میں ہوں کہ بتائیں یا نہ بتائیں ۔پھر ادھر ادھر دیکھا رومی ایک کونے بیٹھی ۔شہاب کو کچھ بتا رہی تھیں ۔

''بڑی لمبی کہانی ہے ۔''

''پھر بھی''

ایک بار انھوں نے غور سے میری طرف دیکھا بولیں ۔

مس نازیہ میں بہت بے ترتیب اور بکھری ازدواجی زندگی جی رہی ہوں اور اس پر یہ مصیبت سمجھ نہیں پاتی کہ کیا کروں'' میں حیرت زدہ انھیں دیکھ رہی تھی ۔میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی ۔کہاں پر کیا غلط ہے؟ کس کا فون تھا؟ کیوں بے چین ہیں کوئی کڑی کہیں ملتی تھیں تو کہیں ٹوٹ جاتی تھیں ۔وہ خود ہی بولیں ۔

شادی کے پہلے میں کسی کو پیار کرتی تھی ۔لیکن شادی نہ ہو سکی ۔حالات ہی کچھ ایسے بنے وہ اپنے ماں باپ سے کہہ نہ سکا اور میں ذہنی اور جذباتی دونوں طرح سے کمزور تھی ۔میں رضوان سے کچھ نہ کہہ سکی ۔نہ پوچھ سکی ۔لیکن دل خون ہو گیا میں بھی جیسے ٹوٹنے لگی تھی میری امی بہت سمجھ دار عورت ہیں ۔اگر میں نے امی کو بتا دیا ہوتا تو آج حالات دوسرے ہوتے ۔امی نے میری حالت سے ضرور کچھ اندازہ لگا لیا تھا ۔اور ان کے بار بار میری اداسی کا سبب پوچھنے پر ایک دن

میں رو پڑی اور سب کچھ بتا دیا۔ وہ سر پکڑے بیٹھی رہ گئیں ''کاش بیٹا تم نے پہلے بتا دیا ہوتا''۔

''واقعی مسز صدیقی ایسی سمجھدار مائیں ہندوستان میں ملتی نہیں'' میں بولی

''میں صرف اٹھارہ سال کی تھی کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی سب کچھ اچانک ہوا کہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ صرف دعائیں مانگتی رہی رضوان کی منگنی ٹوٹ جائے۔ لیکن کہیں دعائیں اس طرح کام کرتیں ہیں!'' وہ خاموش ہو گئیں۔

میں بھی چپ تھی۔ یہ سارے انکشافات میرے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔

''امی نے مجھے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا کہ میں بھی شادی کر لوں۔ انھوں نے اس انداز سے سمجھایا کہ مجھے شادی کرنا صحیح لگا'' اور آپ کی شادی صدیقی صاحب سے ہو گئی اور اب آپ لوگ Adjust نہیں کر پا رہے ہیں'' میں نے پوچھا نہیں صاحب فوراً ایسا نہیں ہوا۔ ابھی جن کا فون آیا تھا اسی زمانے میں ان کی ماں ان کا پیغام لیکر میرے گھر آئی تھیں۔ دیکھنے اور باتیں کرنے میں معقول نظر آتی تھیں۔ ان کے صاجزادے بھی آئے تھے پھر یہ صاحب اکثر یونیورسٹی جاتے ہوئے راستے میں مل جاتے میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔ میں ٹوٹی ہوئی تھی سچ پوچھو تو مجھے ان کی باتیں اچھی بھی لگتی تھیں یہ بھی لگتا تھا کہ شاید شادی بھی انھیں سے ہو جائے۔ مجھے ٹھیک ہی لگتا تھا۔ لیکن جانچ پڑتال سے یہ معلوم ہوا کہ شادی

شدہ ہیں۔اور امی نے بات وہیں ختم کردی۔میرے لئے یہ دوسرا جھٹکا تھا۔مجھے لگتا تھا دنیا بہت ظالم ہے اور میرا نصیب کھوٹا۔کہ اسی زمانہ میں صدیقی صاحب کا رشتہ آیا اور کافی سوچ بچار اور پرکھ کے بعد ان سے شادی ہوگئی رخصتی کے بعد ہی یقین آیا کہ میرے نصیب میں کچھ ہے شادی کے بعد کچھ دن بہت اچھے گزرے ۔دراصل میں ہی بہت سادہ لوح تھی۔کچھ سمجھ ہی نہ سکی ورنہ صدیقی صاحب کا یہی طریقہ تھا جواب ہے۔وہی رات کو بارہ ایک بجے آنا کھانا کھانا بستر پر لیٹنا اور ایک فرض کی طرح مجھے باہوں میں بھرنا اور اپنی جنسی بھوک مٹانا اور سو جانا۔آہستہ آہستہ مجھے یہ میکانکی انداز کھلنے لگا۔اکثر میں ان سے جلدی آنے کو کہتی یہ وعدہ بھی کرتے لیکن کبھی وعدہ پورا نہ ہوتا پھر مجھے اور بھی معلوم ہونے لگا۔ان کے دوسری عورتوں سے تعلقات، جوئے اور شراب کی عادت جو بہت چھپا کر کرتے تھے۔میرے پوچھنے پر انھوں نے خود کہا کہ انھیں کوئی ایک عورت کبھی Satisfy ہی نہیں کرسکتی۔میں بہت روئی گڑگڑائی لیکن بے سود۔یہ پلٹ کے آ ہی نہیں سکتے تھے۔میں نے حالات سے سمجھوتا کرنا شروع کردیا دل کو تسلی دی کہ اگر میری قسمت میں سکھ ہوتا تو رضوان ہی مجھ سے کیوں دور ہوتا۔مجھے تو پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔اتنے دنوں تک پتھر سے کیوں سر پھوڑتی رہی۔کہیں پتھروں پر بھی نشان پڑتے ہیں۔سر ہی لہولہان ہوجاتا ہے" وہ خاموش ہوگئیں میں ہمہ تن گوش تھی۔

بچے کے لئے میں نے سمجھوتا کرلیا۔آنکھیں، کان اور احساسات اور

جذبات سب پر تالے ڈال دیئے نوکری کر لی۔ لیکن ایک ناگہانی مصیبت سے بھی چھٹکارا نہیں مل رہا"۔

وہ صاحب جن سے کبھی رشتہ طے ہو رہا تھا ان کے دونوں لڑکے میرے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ دو سال سے میں ایک کشمکش میں مبتلا ہوں۔

Parents day پر ان صاحب سے پھر ملاقات ہو گئی۔ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ مجھ سے باتیں کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ حالانکہ اس نے کبھی کوئی حد نہیں پار کی۔ اس لئے کبھی کبھی مجھے بھی خوشی سی محسوس ہوتی ہے کہ دنیا میں کوئی تو ہے جو میرے لئے سوچتا ہے بے تاب ہوتا ہے۔ ایک نامعلوم سا جذبہ ہم دونوں کے بیچ ہے جس کی بنیادیں الگ ہیں ۔وہی آرہے ہیں اپنے بچے کے مسئلے پر بات کرنے میں اس سے ملنا بھی نہیں چاہتی اور ملتا ہے تو بھگاتے بھی نہیں بن پڑتا۔ کبھی کبھی الجھن اس کی باتوں سے ہوتی ہے کہ اس کے دل میں میرے لئے نرم گوشے ہیں۔ جس کے دل میں نرم گوشے ہوں اس سے پیار نہیں کر سکتی اور جس سے پیار چاہتی ہوں وہ دور بھاگتا ہے عجیب قسمت ہے۔،،

تبھی دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ انھوں نے دروازہ کھولا اس نے مجھے دیکھا اور چونک پڑا۔

''ارے تم!''

''اور تم یہاں کیسے؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی'' کیا تم ایک دوسرے کو

جانتے ہو'' مسز صدیقی نے پوچھا جواب میں نے ہی دیا۔

''جی مسز صدیقی یہ میرے سابق شوہر نصرت ہیں''۔

رومی حیرت سے کبھی مجھے کبھی نصرت کو دیکھ رہی تھی اور میں کبھی کوئی شکل نہیں بنا پا رہی تھی کس لکیر کو کہاں کھینچوں، کسے مٹاؤں کیا سچ ہے کیا غلط۔

بغاوت

''سارے رشتوں سے بے نیاز ہو جایئے یقین مانئے بڑا سکون ملتا ہے ۔جب تک کھونے کا ڈر ہوتا ہے آدمی پریشان اور فکر مند رہتا ہے'' ناز نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''بجا ہے لیکن بے نیازی آتی کیسے ہے؟'' نوشاد نے پوچھا یہ ایک ایسا فن جو کوئی کسی کو سکھا نہیں سکتا کیا تم بے نیاز ہو گئی ہو''۔

''بہت حد تک ۔اگر کوئی لگاوٹ سر اٹھاتی ہے تو اسے وہیں کچل دیتی ہوں''

''کیسے بھلا؟

''میرے حساب سے پرانے وقتوں کی بات ہے پرانی کہانی پرانی قدریں ایک کہانی سنو''

''سناؤ''

''لیاقت علی ایک آفس میں ہیڈ کلرک تھے''۔

''یہ کلرکوں کی حکمرانی آج کل زیادہ ہوتی ہے''

"کوئی پودا بیج کے بغیر نہیں نکلتا۔

ان کی جگہ تو ہمارے سماج میں انگریز بہت پہلے قائم کر گئے تھے۔ زمانہ بھی صرف دس سال کے عرصے میں ہی بھرپور کروٹ لے لیتا ہے خیر تم کہانی سنو لیاقت علی کی شادی کے بعد چار سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی علاج معالجے میں اور چار سال گزر گئے بیم رجاء منت مراد کے بعد دو بیٹیوں اور دو بیٹوں کے بعد جو تگ و دو شروع ہوئی تو ساٹھ سال کی عمر تک کوئی بھی ان کا سہارا نہ بن سکا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے بڑی بیٹی کی شادی ضرور کر دی تھی اس کے بعد کا بیٹا کام کی تگ و دو میں لگا تھا۔ اس کے بعد کا بیٹا بی۔ ایس۔ سی کر رہا تھا۔ دوسری بیٹی سب سے چھوٹی تھی اور آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ کچھ سال بعد بڑا بیٹا ٹھیکہ داری میں لگ گیا اور دوسرے بیٹے نے بی۔ ایس۔ سی کے بعد وکالت پاس کر لی اور ایک اوسط درجے کا وکیل ہو گیا۔ بہر حال یہ قصہ تو چھوٹی بیٹی کا ہے۔ بڑی بیٹی اور چھوٹی بیٹی کی عمر کے درمیان دس سال کا وقفہ پھیلا ہوا تھا۔

شاذیہ نے جب ہوش سنبھالا صرف سہنا ہی جانا۔ وہ سب سے چھوٹی تھی اس لئے وہ ناسمجھ اور بچی سمجھی جاتی تھی۔ بڑی بہن صبیحہ نے بہت سارے کام گھر کے سنبھال رکھے تھے۔ ساتھ میں ماں بھی لگی رہتی تھیں وہ صبیحہ کو بجیا کہتی تھی۔ لیکن صبیحہ کی شادی ہوتے ہوئے سارا ڈھرّا ہی بدل گیا اماں اکیلے ہو گئیں تو دلاری بیٹی مجبوراً بڑی بنا دی گئی لیاقت علی ریٹائر ہو گئے تو جھاڑو برتن والی بوا بھی ہٹا دی گئی تھی محنت دوگنی اور کام کرنے والے ہاتھ کم پھر ماں کے گھٹنوں نے کام

کرنا بند کر دیا دسویں تک پہنچتے پہنچتے ہاتھ کھانا پکانے جھاڑو برتن اور لکھنے میں
اتنے مشاق ہو گئے کہ اس کو کسی طرف نظر اٹھانے کی بھی فرصت نہ رہی کہ دیکھ
سکے کہ اس کے چاروں طرف اٹھنے والی نظریں اس سے کیا کہہ رہی ہیں وہ کچھ دیر
کو رک گئی۔

''دسویں میں پڑھنے والی لڑکی پندرہ سولہ سال کی تو ہو ہی جاتی''نوشاد
نے کہا

''وہ بھی پندرہ سال کی تھی''

اس عمر تک تو لڑکی کے جسم کے ہر حصے میں آنکھیں ہی آنکھیں ہو جاتی
ہیں۔ جو ہر دیکھنے والے کو سمجھ بھی لیتی ہیں اور پڑھ بھی لیتی ہیں''

''بالکل! لیکن اگر آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے تو''

''کس نے باندھی''

''اماں اور ابا کی نگرانی کرتی آنکھوں نے خود اس کی سہمی شخصیت نے
پڑھائی لکھائی اور گھر کی ذمہ داریوں نے۔ حالانکہ وہ بہت پر کشش تھی لیکن آئینہ تو
آئینہ اسے اپنے جسم کو دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی''

''کیا یہ ممکن ہے؟''نوشاد نے پوچھا۔

''ممکن ہے نہیں۔ تھا۔ لیکن کہیں نہ کہیں دراز تو ہو ہی جاتی ہے۔ کسی
حصہ کی کسی آنکھ کی پٹی ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو وہاں سے وہ اسے دیکھ لیتی۔ مسحور سی
۔اسے اکثر بجیا اور انجو بھیا یاد آتے جو کبھی بجیا کو کیرم کھیلنا سکھاتے ہوئے جب

اسٹرائیکر پکڑنا سکھاتے تو بجیا کی انگلیاں پکڑ لیتے اور بجیا کیسی چھوئی موئی ہو جاتیں۔ وجہ اب اسے سمجھ میں آتی تھی۔ چلو اچھا ہوا اجّو بھیّا نے انگلی پکڑتے پکڑ بجیا سے بیاہ کرلیا۔ اب وہی بجیا جب کبھی گھر آتیں تو اس کی نظروں و باتوں کی ٹوہ میں رہتیں وہ تو زاہد کو چپکے چپکے دیکھ لیتی ہے لیکن زاہد نے تو کبھی اسے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ زاہد اس کے ماموں کا لڑکا تھا اور پڑھنے کی غرض سے رہتا تھا شاید اس سے بھی ڈر رہا ہو لیکن وہ بلا وجہ کیوں دھوکہ کھاتی اور اس سے کیسے نظر بازی کرتی۔ لیکن اتنی پہرداری کے باوجود جانے کیسے یہ بھی ہوگیا

اس دن گھر میں صرف وہ اور ماں تھیں۔ اس سے اماں نے کمبل لانے کو کہا ہلکا جاڑا شروع ہو چکا تھا۔ اماں کے گھٹنوں میں درد بڑھ گیا تھا وہ گھٹنوں کو ڈھکا رکھنا چاہتی تھیں تا کہ درد بڑھ نہ جائے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی کمرے میں گئی ٹرنک کھول کر کمبل نکال کر جونہی پلٹی تو بس چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ زاہد دروازے پر کھڑا مسحور کن نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ چاند کی طرح ٹھنڈک دے رہی تھیں وہ آنکھیں مست کر رہی تھیں۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ سہمی نظریں جھکا کر کھڑی رہ گئی زاہد نے دونوں بازؤں سے اسے پکڑا۔ آنکھوں، ہونٹوں اور ماتھے کو بے تحاشا چومنے لگا۔ سارا جسم انگارہ ہوگیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ تب زاہد کو ہوش آیا۔ وہ گھبرا گیا۔

''شاذیہ! شاذیہ ہوش میں آؤ'' وہ اس کا سر گھبراہٹ میں تیزی سے سہلانے لگا۔ میں تمہیں بہت پیار کرتا ہوں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی تھیں وہ اوپر ہی دوسرے کمرے میں سوتا تھا۔ وہ گھر کب

آیا یہ بات دونوں ماں بیٹی کو معلوم نہ تھی۔

''دیکھو ہوش میں آؤ نہیں تو پھوپھی جان آوازیں دینے لگیں گی''

اور وہ واقعی ہوش میں آ گئی۔ اماں کی جلتی نگاہوں کا سامنا وہ نہ کر پاتی ۔صوفیہ پر اتنی پابندی نہ تھی جتنی اس پر تھی۔ بوڑھا انسان جب جسمانی طور پر کمزور ہو جاتا تو نگاہوں کی پابندیاں خود ہی بڑھ جاتی ہیں۔

وہ کمبل لیکر نیچے آ گئی اماں کے پیروں پر ڈالا اور کچن میں تیزی سے کھانا پکانے لگی۔ ''ناز تھوڑی دیر کو رکی'' کیا اس کی شادی زاہد سے ہو گئی'' نوشاد نے پوچھا

''نہیں ہو سکی''

''کیوں؟

سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ نہ وہ سمجھ سکی نہ زاہد لیکن وہ رات اس کی زندگی میں ضرور امر ہو گئی۔ وہ رات بھر لہروں میں بہتی رہی دل کی دھڑکن تھی کہ قابو میں نہ آتی تھی۔ وہ سوچتی رہی زاہد تو اتنا خوبصورت ہے۔ سرخ و سفید کیوں پسند کرتا ہے۔ اس کا رنگ بہت گورا نہیں تھا اور اس کے خیال میں جتنا زیادہ رنگ گورا ہو گا اتنا ہی وہ شخص خوبصورت ہو گا۔ دوسرے دن جس وقت وہ کو اپنے آئینہ میں دیکھ کر حسن تلاش کر رہی تھی کہ آخر اس میں کیا ہے۔ جو زاہد اس طرح مر مٹا تبھی ابا کی آواز سنائی دی

''اقبال صاحب پندرہ تاریخ کو نکاح کر دینا چاہتے ہیں''

''ارے ہم لڑکی والے ہیں ایک ہفتہ میں کیا کر لیں گے؟''

یہ اماں کی آواز تھی۔''

یعنی اس کی شادی طے ہوگئی۔

''اب بات طے ہوگئی ہے۔زبان ایک ہوتی ہے۔لڑکا بہت اچھا ہے شادی دوسال بعد کردیں گے تب تک شاذیہ بھی سمجھ دار ہوجائے گی ابھی تو بچہ ہے وہ بھی ابھی صرف نکاح کرنا چاہتے ہیں۔''

اور جب اس نے آئینے میں دیکھا تو خود کو ہی بدصورت نظر آئی۔دوسری رات بھی قہر کی رات تھی۔محبت میں آنکھیں ٹھیک سے کھولی بھی نہیں تھیں کہ اس کی موت ہوگئی۔نکاح ہوگیا اور چار سال بعد رخصتی بھی۔اس چار سال کے عرصے میں یہ دونوں راتیں گڈمڈ ہوتی رہیں زاہد اسکے نکاح کے چند دنوں بعد ہی چلا گیا تھا۔وہ جلتے ہونٹ اسے شادی کے بعد بھی تڑپاتے تھے لیکن اس وقت جب وہ بہت دکھی ہوتی''

''کیا شادی بے جوڑ تھی''

''شادیاں تو اکثر بے جوڑ ہی ہوتی ہیں۔زیادہ تر لوگ عمر بھر نباہ کرتے ہیں۔لیکن وہ ساتھ جینا چاہتی ہم سفر بننا چاہتی تھی۔رفیقِ حیات، ہم دم، ہم ساز، ہم نشیں لیکن کہیں بیوی یہ سب ہوسکتی ہے۔کتنی بیجا خواہش کی اس نے۔مرد اگر بیوی کو یہ درجہ دے گا تو اس کے سارے راستے بند نہیں ہوجائیں گے۔مرد جان بوجھ کر اپنی خواہشات کو تشنۂ تکمیل رکھتا ہے تاکہ راستہ بند نہ ہو تلاش ختم نہ ہو جب کے عام طور پر عورت جب ٹھوکریں کھالیتی ہیں تب دوسرے راستے تلاش کرتی

ہے۔

لیکن وہ بے وقوف کسی لائق نہ تھی نہ عاشق کو پھنسا سکی۔ نہ شوہر کو بیوقوف بنا سکی وہ بیوی ہوتے ہوئے بیوی نہ تھی اور معشوقہ ہوتے ہوئے بھی معشوقہ نہ بن سکی۔،،

''کیوں بھئی ایسا بھی کیا؟ عورت بھی کچھ نہ کچھ ہوتی ہی ہے۔ جیسے مرد کسی کا بھائی کسی کا بیٹا کسی کا عاشق عورت بھی کسی کی ماں کسی کی بیٹی کسی کی بہن کسی کی معشوقہ ہوتی ہی ہے''۔

''سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ عورتیں صرف عورتیں ہی ہوتی ہیں مٹی کا مادھو۔ جو عورت اپنی پہچان بنانا چاہتی ہے اسے تو عورت بھی نہیں سمجھا جاتا شاذیہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا وہ حساس کیوں ہے؟ اس نے اکثر خود سے یہ سوال کیا اس کا شوہر تو اس بھی بے نیاز تھا ان شوہروں سے بھی بدتر جو شراب پی کر اپنی بیویوں کو مارتے پیٹتے ہیں ان میں بھی کچھ لگاؤ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو اتنا لگاؤ بھی نہ تھا شاذیہ نے خود اپنے لگاؤ کی خاطر اس کھونٹے سے اپنے کو باندھ رکھا۔ ذلت اور Neglegene سہتی رہی۔ اس کو ہی بچوں کی خواہش تھی ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ گھر میں بند تھی۔ وہ ایک اسکول میں پڑھاتی بھی تھی۔ وہ جو کھونٹے سے بندھی رہی تو کھونٹا نہیں پکڑے تھا بلکہ وہ خود کھونٹے کو پکڑے تھی۔ اور جب پکڑے پکڑے ہاتھ دکھنے لگے تو کھونٹا ہاتھ سے چھوٹنے لگا اور ایک دن بغیر آواز کے کھونٹا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس دن اسے احساس ہوا کہ اس کھونٹے کو پکڑے

رہنے میں کتنی تکلیف تھی کہ اس کے ہاتھ کس قدر زخمی ہو گئے تھے اور اب کتنا آرام ہے۔

''کیا طلاق ہو گیا'' نوشاد نے پوچھا۔

''نہیں شاذیہ ہی بے نیاز ہو گئی۔ اس کے بے نیاز ہوتے ہی کھونٹا بے چین ہو گیا۔ اس کو لگا کہ اب اس کی اہمیت نہیں رہ گئی اور قبضہ ختم ہو رہا ہے۔ اس کا شوہر اسکے پیچھے ڈوڑتا ہے لیکن شاذیہ نے تو بت شکنی کر ہی ڈالی اور بے نیازی کا سکون بھی پالیا اس کو صرف اتنا افسوس ہے کہ اس نے بے وجہ تکلیف کیوں اٹھائی۔

''اب وہ کہاں ہے؟

وہ اٹھی اور نوشاد کے قریب بیٹھ گئی نوشاد نے حسبِ معمول اسے باہوں میں جکڑ لیا اور بوسے لینے شروع کر دیئے۔

''اب وہ نوشاد کی باہوں میں ہے'' کہہ کر وہ شدت سے اس سے لیٹ گئی۔

جیون داتا

یاسمین ابھی ابھی اٹھ کر گئی ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ میری ماں بیمار ہیں۔ بیمار ہی نہیں بہت بیمار ہیں۔ ہم دونوں بچپن کی سہیلی ہیں۔ وہ کل ہی میکے سے پلٹ کر آئی ہے ہمارا میکہ ایک ہی شہر میں ہے۔ لیکن میں خود بیمار ہوں پھر بھی جانا ہوگا دل بہت بے چین ہے سب بھائی بہن اسی شہر میں رہتے ہیں میں ہی دور ہوں اکیلے ہی جانا ہوگا۔ احمد کو تو اتنا کام رہتا ہے کہ انھیں میرے مسائل اور دکھ درد کو سمجھنے کی بھی فرصت نہیں شاید اس سے کوئی مطلب بھی نہیں رکھتے۔ اس لئے میں نے Packing شروع کر دی اور شام کی ٹرین سے چھ سالہ بیٹے راغب کو لے کر چل دی۔ دراصل مجھے کئی دنوں سے بخار تھا احمد کو چھٹی نہیں تھی اور میری ہمت نہیں پڑتی تھی ڈاکٹر کے پاس جاؤں گھر کے کام کاج کے بعد ایک چیز سمجھ میں آتی تھی کہ بس آرام کروں پور پور دکھنے لگتا تھا۔ ٹرین پر بھی مجھے عجیب غنودگی سی چھائی ہوئی تھی۔ ہفتہ بھر کے Crocin کے استعمال نے بھی اب اپنا سارا اثر کھو ڈالا تھا۔ اب میں کسے دوش دوں۔ میں نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا جیسے دل میں ایک خیال تھا کہ جب گھر پہونچوں گی تو پاپا خود ہی میرا علاج کروائیں گے

۔ویسے احمد کی میرے اوپر کوئی پابندی نہیں تھی ۔کہیں بھی کبھی بھی آجا سکتی تھی
۔جذباتی آسودگی اور توجہ کے لئے ترستی تھی۔

ایک دو بار لگا کہ آس پاس کے لوگوں کی نظریں مجھے گھور رہی ہیں۔میں جوان تھی اور اچھی شکل وصورت کی مالک۔یہ تو ہر عمر کے مرد کے لئے دعوت ہی ہوتی ہے

شاید مجھ سے کسی نے پوچھا بھی تھا کہ کہاں جارہی ہوں لیکن میرا ذہن ماضی میں الجھا تھا۔بخار الگ۔

مجھے شدید پیاس لگی تھی جلدی میں پانی بھی رکھنا بھول گئی تھی ۔میرا سر بھی چکرا رہا تھا کسی سے پانی مانگنا اپنے لئے مصیبت بلانا تھا۔ایک چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی رکی اور میں پانی پینے اتر پڑی۔پانی پیتے پیتے مجھے چکر آ گیا میں یونہی پائپ پکڑے کھڑی رہ گئی۔گاڑی نے وسل دی اور چل دی میں یونہی پائپ پکڑے کھڑی رہ گئی۔سمجھ میں سب آرہا تھا لیکن کچھ کرنہیں پارہی تھی۔ایک لمحے میں سب کچھ گھوم گیا گاڑی کا چل دینا بچے اور سامان کا چھوٹ جانا اچانک پیدا ہوئے حالات سے میری برداشت کی طاقت ختم ہوگئی تھی اور میں لڑکھڑا کر اسی جگہ بیٹھ گئی تھی ۔اچانک میں نے اپنے کندھوں پر کسی کے ہاتھ محسوس کئے۔کسی نے ہمدردی سے سہارا دیا۔اس شخص نے کچھ کہا بھی تھا لیکن جواب دینے سے معذور تھی۔جب ذہن کچھ کام کرنے لگا تو سر اٹھایا شکل کچھ پہچانی سی لگی راغب بھی پاس ہی کھڑا تھا اور میری اٹیچی بھی وہیں تھی۔میں حیرت سے سب دیکھ رہی

تھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا''۔ یہ آپ ہی کا بیٹا اور آپ ہی کی اٹیچی ہے،، اس کے ہونٹوں پر انسانیت بھری مسکراہٹ تھی اس نے شاید میری نظروں کے سوال پڑھ لئے تھے لیکن میں اب بھی کچھ بولنے اور سمجھنے کے لائق نہ تھی۔ صرف ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

''اوہ میں بھی اس ٹرین میں آپ کا ہم سفر تھا۔ ٹرین میں ہی آپ مجھے بیمار لگی تھیں۔ جب آپ اتریں تب بھی لڑکھڑا رہی تھیں۔ مجھے لگا آپ کو مدد کی ضرورت ہے میں کھڑکی سے دیکھتا رہا اور آپ کو یونہی کھڑے دیکھا تو فوراً آپ کے بیٹے اور اٹیچی کو لے کر اتر آیا۔ جب آپ بیمار تھیں تو آپ کو اکیلے سفر نہیں کرنا چاہئے تھا'' ''سفر ضروری ہو کوئی ساتھ دینے والا نہ ہو تو؟'' دل کی کرواہٹ زبان پر آ ہی گئی۔ پچھتا رہی تھی کہ ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔

''پھر بھی بیماری میں سفر نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے آپ کو تکلیف کیا ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں دوائیں تو بیگ میں رکھے ہی رہتا ہوں۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا کیا میں اتنی بیمار ہوں کہ خدا کو میرے پیچھے ایک ڈاکٹر کو لگانا پڑا۔ ایک بارگی میں اپنے اصلی مزاج میں آ گئی۔

''جب ڈاکٹر ہم سفر ہو تو بیماری میں سفر کیا جا سکتا ہے''۔ یہ بات شاید امید کے خلاف تھی پہلے تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔

''لیکن محترمہ اپنی بیماری کے باوجود ڈاکٹر کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔ ڈاکٹر کو خود ہی مریض کو اپنے وجود کا احساس دلانا پڑا۔''

ایک حملہ کمزوری کا پھر مجھ پر پڑا۔اس کا اندازہ میرے ہم سفر کو ہو گیا تھا۔

''آپ فوراً بیٹھ جایئے کہاں جانا ہے''

''لکھنؤ'' اب مجھے احساس ہوا کہ میری مدد کرنے کی وجہ سے اس کو ٹرین چھوڑنی پڑی۔

''معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب آپ کو میری وجہ سے ٹرین چھوڑنی پڑی مجھے بڑی شرمندگی ہے آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''وہیں جہاں آپ کو جانا ہے۔اور شرمندگی کس بات کی مریض کو ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے اور ڈاکٹر کا فرض ہوتا ہے کہ مریض کی مدد کرے۔''

اس کا نام نوین تھا وہ بھی لکھنو کا رہنے والا تھا۔اس نے مجھے دوا دی۔ مجھے کافی آرام ہو گیا پھر لکھنو آنے تک میرا خیال رکھتا رہا۔ مجھے بڑا سکون مل رہا تھا۔شاید مجھے اس کی ضرورت بھی تھی۔ مجھے اس نے پتہ اور فون نمبر بتایا۔ پھر میں رکشہ کر کے گھر آ گئی۔

امی کی طبیعت واقعی بہت خراب تھی بلڈ پریشر تو بڑھا ہی رہتا تھا اب تیز بخار بھی ساتھ میں ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ دوسرے دن میں نے نوین کو فون کیا اور ممی کو دیکھنے کے لئے کہا۔نوین آئے بھی اور ان کی دواؤں سے انھیں فائدہ بھی ہوا۔تقریباً دس دنوں تک میں وہیں رہی۔اب ممی بھی ٹھیک ہو چلی تھیں میں بھی واپس گھر لوٹ گئی۔زندگی اسی نیرس ڈھرّے پر چلتی رہی۔ بیچ میں اکثر بیمار ہوتی رہی میں احمد سے پوچھتی ''شام کو کب آرہے ہو''

''کیوں؟''

''ذراڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔میری طبیعت خراب ہے۔

شام کو آنے میں مجھے کافی دیر ہوجائے گی تم دن میں ڈاکٹر کے پاس چلی

جانا''

میں جانتی تھی احمد کو آنے میں کیوں دیر ہوگی میں جانتی تھی اسے میری تکلیف کا احساس نہیں ہے لیکن پھر میرے دل میں جانے کیوں خواہش ہوتی تھی دبی ہوئی خواہش جسے میں بھی نہ سمجھ پاتی کہ مجھے احمد کا ساتھ مل جائے۔حالانکہ بار بار زخمی ہوتی تھی۔لیکن یہ عادت نہیں چھوٹتی تھی۔''تاش تو تم روز کھیلتے ہو آج میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلے چلو۔''

تاش!! یہ احمد دکھتی رگ تھی۔لیکن اس نے یہ کبھی قبول نہیں کیا کہ وہ جوا کھیلتا تھا اور ہمیشہ اس سے انکار کرتا رہا۔دوسری عورتوں سے Affair بھی ہوتے لیکن ہمیشہ اس نے یہی کہا کہ اسے اپنی بیوی پسند ہے۔میں نے بھی یہ جملہ شاید اسی لئے کہا تھا کہ اسے معلوم ہوجائے کہ میں جانتی ہوں کہ وہ جوا کھیلتا ہے واقعی یہ جملہ نشانے پر بیٹھا۔

''یہ تمہارے دماغ کا کیڑا ہے مجھے آفس میں بہت سے کام رہتے ہیں۔''اور وہ تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کرکے چل دیئے۔مجھے معلوم تھا کہ اس جملے کے جواب میں آج رات اور دیر سے آئیں گے۔لنچ میں بھی گھر نہیں آئیں گے۔یہی ہوتا ہے پچھلی لگی چوٹ اور گہری ہوجاتی۔میں آج تک اس کا مداوا نہ

کر سکی ذہنی پریشانیوں نے مجھے اپنی جسمانی تکلیفوں سے بھی بیگانہ کر دیا تھا شام ہوتے ہوتے بخار بہت تیز ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے جانے کیوں ڈاکٹر نوین یاد آئے۔ شاید دل جوئی اور علاج دونوں کی ضرورت تھی۔

کافی رات گئے احمد آئے شادی کے بعد پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ احمد کے آنے سے پہلے سو گئی یا پھر بخار کی شدت کی غفلت تھی کیونکہ گھنٹی کی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔ اور دروازہ اتنی شدت سے پیٹا جا رہا تھا کہ میں ہڑ بڑا کر اٹھی اور فوراً دروازہ کھولا اور اسی طرح بستر پر آ کر گر گئی۔ مجھے امید بھی نہیں تھی کہ احمد میرا حال پوچھیں گے۔ میرا دماغ بالکل ماؤف تھا اتنا بھی نہ ہو سکا کہ احمد سے کھانے کے لئے پوچھوں احمد نے اسے میری بے رخی پر محمول کیا ہو گا میں تو تھی اس کے ٹھینگے پر۔

مجھے نہیں معلوم رات کیسے بیتی۔ آنکھ نو بجے کھلی جب احمد نے جھنجھوڑ کر جگایا کیونکہ دروازہ بند کرنا تھا۔ پہلی بار میں صبح نہ اٹھ سکی۔ راغب بھی شاید میری حالت جان چکا تھا وہ مجھے کبھی پریشان نہیں کرتا تھا۔ چاہے کتنی چوٹیں پہنچیں میں ناشتہ کھانا ہمیشہ وقت پر تیار رکھتی تھی آج تو میں جیسے غشی کی حالت میں تھی۔ شاید احمد نے یہ سوچا ہو گا کہ میں بے رخی میں ایسا کر رہی ہوں۔ اسی لئے انھوں نے مجھے جلدی جگانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنی دانست میں میری ناراضگی سے ہی مجھے سزا دینا چاہتے تھے۔ میرا ہاتھ چھوتے ہی شاید انھیں احساس ہوا کہ مجھے بخار ہے

''تم کل ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں گئیں؟'' انھوں نے نرم اور سپاٹ

لہجے میں کہا مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو میں اندر ہی اندر پی گئی۔

''اس طرح مجھ سے بدلہ لینا چاہتی ہو'' یہ چوٹ بے وجہ تھی میں خاموش ہی رہی ''میں نے تمہیں آزاد رکھا ہے۔کوئی پابندی نہیں جہاں چاہو آؤ جاؤ۔قدم قدم پر میرا منہ کیوں دیکھتی ہو؟''

''یہ آزادی نہیں اسے بے رخی کہتے ہیں یہ جملہ ذہن میں بار بار آرہا تھا لیکن میں کہہ نہیں سکتی تھی اس کا پلٹ وار مجھے ہی چور چور کرتا۔پھر خاموشی۔

''کل کیوں نہیں گئیں ڈاکٹر کے پاس؟''

آج میرے ہونٹ بالکل سل گئے تھے۔دل کا زخم چھپا کے اس Court martral کے لئے دل کوئی جھوٹا بہانا بھی بنانے کو نہیں کر رہا تھا۔جیسا کہ پہلے کرتی تھی۔لیکن میری خاموشی شاید احمد کی Hurt Ego کو کر رہی تھی۔میں بول نہیں پا رہی وہ سمجھ نہیں سکتے۔جو وہ سمجھ سکے اس کا اظہار اتنا کڑوا تھا کہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

''تم کیا سمجھتی ہو اس طرح مجھے غلام بنا لو گی۔میری آزادی چھین لو گی دیکھتا ہوں کیا کرتی ہو''۔اور وہ آفس چلے گئے۔آج تو اس زخم کی شدت بھی نہیں محسوس کر پا رہی تھی۔شاید جسم کی تکلیف نے ہر تکلیف کو بھلا دیا تھا۔ہو سکتا ہے وہ آج رات کو واپس آئے ہی نہ۔میں پھر بے سدھ ہو گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب پوسٹ مین کی آواز آئی۔ایک لفافہ پڑا تھا

شاید ممی کا خط ہو یا پھر میری دوست تمکین کا۔ مجھے شاید کسی دوست کی ضرورت تھی۔لکھاوٹ اجنبی لگی حالانکہ خط میرے ہی نام تھا جب کھولا تو مجھے سخت حیرت ہوئی یہ خط نوین کا تھا اس نے میری خیریت پوچھی احمد اور راغب کا حال چال بھی جاننا چاہا تھا۔دواؤں کے بارے میں جاننا چاہا۔پھر بھی جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ یہ خط شاید صرف اس نے صرف ایک جملے کے لئے لکھا تھا۔"مجھے اکثر آپ کا خیال آتا ہے میں اتنا زیادہ کسی سے متاثر نہیں ہوا۔"

یہ کیسا خط تھا کہ میں اس پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی۔گویا وہ خط نہ ہو نوین کا شانہ ہو۔ہمدردی کے چند الفاظ جنھوں نے مجھے چاک چاک کر ڈالا دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا۔آج ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے بہت بڑی خوشی مل گئی ہو۔اپنا دکھ بھول گئی۔اس خط میں ایسا کچھ تھا جو میرا اپنا تھا۔شاید اسی لئے میں نے اس کو لاکر میں رکھ دیا۔اتنے تیز بخار کے باوجود میرا ذہن ہلکا تھا۔میں نے اٹھ کر Crocin ڈھونڈھی۔تھوڑی دیر میں بخار ہلکا ہو گیا۔بیچارہ راغب کب کا بسکٹ وغیرہ کھا کر سو گیا تھا۔میں نے جلدی سے کھچڑی پکائی راغب کو اٹھا کر کھلایا وہ میرے گلے لگ گیا۔"ممی" بخار اتر گیا نا میں نے خوب پھونکا تھا۔

"پھر وہ خوشی خوشی T.V کھول کر بیٹھ گیا۔میری نیند غائب ہو چکی تھی بار بار نوین کا چہرہ یاد آرہا تھا۔سفر میں ملنا دوا دینا، بار بار گھر آنا باتیں کرنا سب بڑا اچھا لگ رہا تھا۔شام تک بخار ہلکا ہو گیا۔شاید جینے کی تمنا جاگ اٹھی تھی۔

اس دن احمد خلاف توقع جلدی گھر آگئے میں نے چائے اور بسکٹ دیئے

مجھ سے پوچھا بھی دوا لے آئیں مجھے لگا کہ شاید انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے لیکن دل نہیں مان رہا تھا سو میں نے کہہ دیا "ہاں لے آئی۔"

چائے پی کر پھر تیار ہونے لگے میں نے سوچا مجھے دیکھنے آئے ہوں گے اب پھر اپنی پناہ گاہ میں جا رہے ہونگے۔ میں نے کچھ پوچھا نہیں۔ خود ہی کہا۔

"رفیقہ آ رہی ہے اسے لینے جا رہا ہوں کھانا زیادہ پکا لینا"۔

اوہ تو اس لئے جلدی آئے تھے۔ آپ کو شاید میں نے بتایا نہیں، یہ رفیقہ احمد کی بہن ہیں۔

سب سے بھاری چوٹ میں بیمار ہوں اور اس کا خیال نہیں لیکن یہ حکم کہ کھانا تیار رہے اور پھر اتنا ہی نہیں کم سے کم ایک ہفتہ کی خدمت گزاری اور اجرت کیا ملے گی۔ صاحبزادی کے طعنے، ہر کام ہر بات میں مین میخ اور بھائی کو میرے خلاف اور بھڑکانا لیکن اب میں سب جھیل جاؤں گی۔ میرے پاس نوین کا خط جو ہے۔ اس میں ہمدردی ہے، اپنا پن ہے محبت بھی ہے شاید۔

مجھے پھر بخار تیز ہونے لگا اور میں بے سدھ ہو گئی آنکھ اس وقت کھلی جب گھنٹی بجی۔ کسی طرح دروازہ کھولا۔

ہلو! بھابھی کہہ کر رفیقہ مجھ سے لپٹ گئی میں اس ڈرامے کو سمجھ رہی تھی لیکن بھائی صاحب نہال تھے کہ ان کی بہن نہ صرف ان کو بلکہ بھابھی کو بھی بہت چاہتی تھی۔ یہ تو بھابھی ہی نا کارہ ہے جو اس کو سمجھ نہیں پاتی۔ یہی اس کا مقصد تھا۔

رفیقہ کی پہلی منزل فتح ہوگئی لیکن اس کو تیزی سے الگ بھی ہونا پڑا۔

''کیا آپ کو بخار ہے''

''ہاں''

''بہت تیز ہے دوا نہیں کھا رہیں کیا؟''

دل تو چاہا کہ کہہ دوں Overdose سے بیمار ہوگئی ہوں۔ اتنی محبت ملتی ہے کہ برداشت نہیں ہوتی۔ لیکن چپ رہی آج یہ خاموشی کیوں لگ رہی ہے .احمد کو لگا کہ اگر میں بیمار رہی تو بہن کی خدمت کیسے ہوگی۔

''بخار؟'' ''بخار نہیں اترا؟ اچھا ٹھہرو میں ابھی دوا لے کر آتا ہوں۔ بخار کے علاوہ اور کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟'' میں ایک ٹک دیکھتی رہی حالانکہ تکلیفیں کئی تھیں لیکن کہا'' نہیں صرف بخار ہے'' جلدی ہی دوا آ گئی کہنے کی ضرورت نہیں دوا کھاتی رہی طبیعت ٹھیک ہوتی رہی۔ برابر خدمت کرتی رہی اور طعنے بھی سنتی رہی بھابھی تو بڑی Backward ہیں۔ بھابھی کے ہاتھ کے پکے کھانے میں مزا نہیں ہوتا۔ بھیا آپ بھی بھابھی کے غلام ہوگئے۔ یہ چند نمونے اس لمبی فہرست کے تھے۔ جو خطابات مجھے ملتے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں نوین کا چہرہ اور نوین کے خط کے الفاظ ایسے موقعوں پر یاد آ جاتے تھے۔

بھائی نے آفس سے چھٹی لی بہن کو جگہ جگہ گھمانے کے لئے رات رات بھر باتیں ہوتیں دونوں میں۔ نئے نئے نسخے بتائے جاتے اس انداز میں کہ بھائی مجھے قابو میں کر کے سبق یاد رکھ لیں۔ میں شاید بے نیاز ہوگئی تھی مجھے دکھ کم ہوتا تھا

ان باتوں سے۔میں نے نوین کے خط کا جواب دیا۔اس بار اس کے خط میں لکھا تھا" آپ جیسا دوست مجھے کوئی نہیں ملا۔آپ سے مل کر باتیں کر کے بڑا لطف رہتا تھا اب آپ کب آ رہی ہیں"

وہ دل جو ہر چیز سے بیگانہ ہو گیا تھا اپنے حالات سے بے نیاز تھا۔لکھنو جانے کو مچل اٹھا۔میں نے خط کا جواب دیا اور پہنچنے کی تاریخ لکھی اور واقعی لکھنو پہنچ گئی۔نوین اسی شام کو گھر آئے۔کیا باتیں ہوئیں اب تو یاد نہیں لیکن کچھ ایسا ضرور تھا کہ میں اس دن بہت خوش تھی۔

اس رات جب تمکین گھر آئی تو اس نے بھی پوچھا کیا بات ہے تو آج بہت خوش ہے۔کچھ ہے کیا؟ مراد Pregnency سے تھی راغب کے بعد سے تین بار Abortion ہو چکے تھے۔لوگ میرے دکھ کی وجہ یہی سمجھتے تھے۔

تیسرے دن میں نوین کے Clinic گئی۔Checkup کے لئے میں اپنی بیماریاں بتاتی رہی وہ چیک اپ کرتے رہے۔پھر اچانک انھوں نے مجھ سے پوچھا" آپ کی Married life کیسی ہے؟"میں چونک گئی یہ کیوں پوچھا کیسے جانا؟

کیا میں نے خط میں کچھ لکھ دیا تھا۔

"معاف کیجئے میں ڈاکٹر ہوں کچھ تکلیفیں جو جسمانی ہوتی ان کی وجہ ذہنی پریشانی ہوتی ہیں۔اس لئے پوچھا"

میں ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔پھر جو آنسو بہنے شروع ہوئے تو رو کے

نہ رکے ۔ یہ ساری بے نیازی سخت دلی اس کے سامنے کیوں ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کب اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور میں وہ سارے زخم اس کو دکھاتی رہی جو سات سال سے سینے سے لگائے تھی ۔ وہ سراپا گوش تھا۔ کوئی میری تکلیف میرا دکھ کو یوں ہی بھی سن سکتا ہے وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور میں جانے کیوں اس کے سینے سے الگ نہیں ہو پا رہی تھی ۔ کیسے وہ اپنا ہو گیا ایک لمحے میں جسے سات سال سے اپنا سمجھے بیٹھی تھی اور وہ ایک لمحے کو بھی میرا نہ ہو سکا دنیا مجھے کچھ کہے بھی تو اب مجھے پرواہ نہیں میرا اپنا تو یہی ہے جو میرا دکھ بانٹ رہا اور دور کر رہا ہے۔

جو ہم پہ گزری

میرا دل جب درد سہتے سہتے تھک گیا تو میرا دماغ چوکنا ہوا۔ لگا کچھ ایسا ہے جو دل سے الگ ہے۔ معاملہ سمجھنے میں کچھ دیر ہوئی اور آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ کچھ جانچ ہو جائے تو جناب جب دل کی پکار سننے کے لئے Echo test ہوا تو معلوم ہوا کہ دل تو اسی طرح چیخ رہا ہے۔ لیکن خون کی کمی ہو گئی ہے۔ پہلی بار اس شعر کے صحیح معنی معلوم ہوئے۔

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

شاید دل اس لئے چیخ رہا تھا Investigation سے معلوم ہوا کہ پیٹ میں Tumor اپنا گھر ہی نہیں بنا چکا ہے بلکہ آہستہ آہستہ دوسرے گھروں پر بھی قابض ہو رہا ہے۔ اس لئے آپریشن کروانا ضروری ہو گیا۔

جسم کا زیادہ تر خون Tumor کے استعمال میں آ چکا تھا۔ جس کا اعلان میرا دل بہت دنوں سے کر رہا تھا اور مصیبت یہ کہ اس شیر کو جسم سے نکالنے سے پہلے بھی خون پلا کر منانا ضروری تھا۔ چار بوتل خون کی مانگ تھی۔ اور یہ چار

بوتل خون ملا چار نوجوانوں سے۔نوجوانوں کا گرم خون (عجیب خون کی پیاس تھی) میں نے بہت کہا کہ اس بڑھتی ہوئی عمر میں میری ہی عمر والوں کا خون ہوتو ہی اچھا ہوگا۔ذرا آسانی سے گھل مل جائے گا کہیں ایسا نہ کہ نوجوان خون اور پرانے خون میں کچھ نا اتفاقی ہو جائے تو دل کہاں تک سمجھوتا کرے گا۔میری کسی نے نہ سنی آخر ہوا وہی اب تو پہلے دن سے اس کا اثر ظاہر ہونے لگا تھا جنوری کی شدید سردی میں اکثر رات کو میرے سر سے پسینہ نکلنا شروع ہو جاتا میں نے اپنے شوہر کو احساس دلایا کہ اسی لئے میں نے منع کیا تھا۔اب دیکھو تماشہ جب پرانا خون زور کرتا ہے۔تو شدید سردی کا احساس ہوتا ہے۔اور جب نیا خون حاوی ہوتا ہے تو گرمی سے گردن و سر پسینے سے تر بتر ہو جاتا ہے۔اور جیسے جیسے خون چڑھتا رہا تو جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوتا رہا کہ میں بقرعید میں قربان ہونے والے بکرے کی طرح ہوں۔

دو دن سے ایک عزیز اکثر خبر گیری کے لئے آتے تھے انھوں نے کئی بار پوچھا کچھ ضرورت ہو کچھ کام ہو تو بتایئے مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کام بتاؤں آپریشن ہونے والے دن بھی وہ خیریت لینے آئے اور وہی بات دہرائی .اچانک مجھے ایک کام یاد آ گیا میں نے کہا ''ہاں ہے تو سہی''

''بتایئے باجی''

''میری جگہ تم آپریشن کروالو آپریشن کا فرض بھی پورا ہو جائے گا اور میں تکلیف سے بچ جاؤں گی۔''

وہ تو ہنستے رہے لیکن بخدا اگر کوئی ساتھ دیتا تو اس دن میں یہی راستہ نکالتی

تین بجے قربانی کا وقت مقرر ہوا بارہ بجے سے مجھے احساس دلایا جانے لگا آج میرا کیا انجام ہونا ہے کبھی گلوکوز لگا کر کبھی اسپتال کے کپڑے پہنا کر کبھی آنکھوں وغیرہ کا جائزہ لے کر۔

اس وقت تک میرے دوسرے رشتے دار بھی الہ آباد سے دیکھنے آگئے تھے۔ کاش وہ لوگ کچھ پہلے آگئے ہوتے تو ان کی باتیں ہی بغیر چیر پھاڑ کر آپریشن کر دیتیں۔

ہم مسلمان ہمیشہ نزاعی مسئلوں میں الجھے رہتے ہیں۔اور میرے کچھ رشتے دار تو یوں بھی ''تخالص'' مسلمان اور شرعی مومن تھے۔ان کو اعتراض تھا بہت سی باتوں پر ان کو اس کے اس بنیادی اصول سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ انسان کی زندگی سب سے قیمتی ہے۔اور اسے ہر حال میں بچانا چاہئیے ان کو صرف اس سے غرض تھی کہ کیسے یہ ثابت کیا جائے کہ ہم لوگ اسلام سے کس قدر دور ہیں ۔ادھر ہم آپریشن تھیٹر میں لے جائے جارہے تھے۔ادھر میری ایک مومن رشتے دار نے اس مسئلے پر آواز اٹھائی۔ان کو ملت میں کھوٹ کا ڈر تھا کافر خون میری رگوں میں ڈور رہا تھا (تین بوتلیں خون تو ہندوؤں کی تھیں)۔اس کے بعد میرا زندہ رہنا ملت کے لئے خطرہ تھا۔۔ان کا مومیانہ قول تھا ان کا بیٹا تو بچہ تھا یہ تو بڑوں کو خیال رکھنا چاہیے تھا کہ کافر خون نہ چڑھایا جائے۔ پر مجھے اپنی زندگی کا خیال تھا کسی جانور کا خون بھی سوٹ کر جاتا تو میں اسے بھی آسانی سے چڑھوانے کی

اجازت دے دیتی۔ سنا ہے میری بہن کو یہ بات بری لگی تھی اور وہ لڑ پڑی اس کو ملت سے زیادہ بہن پیاری تھی۔ مجھے بھی اپنی غلطی احساس ہوا دراصل ہم لوگوں کو پہلے ہی ان رشتہ دار کو خبر کر دینا چاہیئے تھا کہ وہ الہ آباد سے مسلمانوں کا خون ایک ناشتہ دان میں بھر کر لیتی آتی تو میرے کام آتا۔ ساتھ ہی ساتھ ان کو پاک کرنے کا انتظام کر دیا جائے کہ ہمارے آباؤ اجداد سے سارا کافر خون جو وراثت میں شامل ہوا ہے۔ اسے بھی الگ کر دیا جائے۔ شاید میرے جسم میں خون کے اسی حصے نے اتنی آسانی سے کافر خون کو بھی جذب کر لیا۔

میں نے پہلے ہی بتایا تھا کہ میرا دل احتجاج کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں کو اس پر بھی نظر رکھنی تھی اس لئے سینے اور پسلیوں پر مختلف مقاموں کوئی تین منہ والی چیزیں بھی لگائی گئی تھیں۔ مجھے پھر دل کی تیز آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ اب خدا جانے آپریشن میں کیا کیا گیا۔ وہ میں نے ڈاکٹر رعنا اور ڈاکٹر عبداللہ ڈاکٹر حامد کے ایمان پر چھوڑ دیا تھا۔

دوسرے دن مجھے ہوش آیا سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا گلوکوز ابھی میرا ساتھی تھا تیسرے دن مجھے بائیں پسلی کی طرف ٹرانسمیٹر جیسی کوئی مشین چبھی میں گھبرا گئی اس کو نوچ لیا اور اپنے آس پاس کے لوگوں سے پوچھنے لگی کسی نے ڈاکٹر کی برائی تو نہیں کی۔ میرے جسم میں ٹرانمیٹر لگا ہوا تھا۔ اب میں اس کا راز سمجھ نہ سکی کہیں ڈاکٹر میرے دل کا راز تو نہیں جاننا چاہتا تھا۔ چلو اچھی بات یہ تھی کہ چیز جسم کے باہر تھی۔ کہیں یہ سب پیٹ کے اندر رہ ہوگئی ہوتی تو زندگی بھر ڈاکٹر سے

دل کا رشتہ نہ ٹوٹتا۔ میں نے آپریشن سے پہلے ڈاکٹروں کو ایک مشورہ دیا تھا کہ پیٹ کھول ہی رہے ہیں تو اندر کے اور اعضا کا بھی معائنہ کر لیں کوئی اپنے پیٹ پر کیوں لات مارتا۔ ایک ٹکٹ میں کئی کئی نمائشوں کا مزا (ضرور ڈاکٹر نے سوچا ہوگا کیونکہ مجھ سے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کی) پیٹ کے ٹیومر کی سختی مجھے اوپر محسوس ہو رہی تھی میں نے کہا بھی ذرا ڈاکٹروں سے پوچھ لو کہیں کوئی ٹیومر پھسل کر اوپر تو نہیں چلا گیا۔ آپریشن کے بعد اس طرح کے بہت سے خطرے رہتے ہیں خطرہ تو یہ بھی رہتا ہے کی کہیں اندر کوئی Instrunaent ہی نہ چھوٹ گیا ہو۔

چوتھے دن گلوکوز نے مجھے چھوڑا۔ کم بخت جان کو ہی آ گیا تھا۔ لیکن اب دوسری مصیبت تھی ہر آدھے گھنٹے پر مختلف نرس اور ڈاکٹر ایک سوال دوہراتے gas پاس ہوئی۔'' میں پریشان مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں اندر اعضا کی غلط جڑائی تو نہیں ہو گئی یا پھر آنتوں کا Original گھماؤ ہی نہیں بدل گیا ہو۔ یہ شبہ تب یقین میں بدل گیا جب Motion ہونے میں تین دن لگ گئے مجھے لگا کہ نیا راستہ ڈھونڈنے میں یقیناً دقت پیش آئی ہوگی۔

اسی زمانہ میں میرے کمرے سے ملحقہ کمرے میں ایک اور مریضہ آ گئیں۔ میں تو خیر اٹھنے کے لائق بھی نہیں تھی بس دیکھتی رہتی کہ ایک محترمہ اکثر میرے شوہر سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ اور کوئی موقعہ ہوتا تو کب کی میں انھیں اپنی باتوں میں لگا لیتی۔ لیکن خیر انسان پر ہر طرح کے وقت پڑتے ہیں۔ میں متجسس تھیں کہ ان کی مریضہ بہو کی Condition میرے مقابلے میں

کیسی ہے۔ایک دن میرا حال اس انداز سے پوچھنے لگیں گویا میں اس کے بغیر صحت یاب نہیں ہوسکتی ۔اور تسلی کے لئے جو الفاظ انھوں نے استعمال کئے اس سے تو مجھے یہ شبہ ہونے لگا ڈاکٹر شاید غلط بات بتا رہے ہیں۔اب میں کبھی صحت یاب نہیں ہوسکوں گی۔ظلم تو تب ہوا جب ان کی بہو Discharge کردی گئی اور میں ابھی بستر پر ہی پڑی تھی ۔جاتے وقت وہ جذبہ تفاخر سے ملیں ۔اس نے مجھے احساس کم تری میں بتلا کردیا۔یہ تو اچھا ہوا چار دنوں بعد میں بھی Discharge ہوگئی ورنہ مجھے وحشت میں صرف قبرستان کے خواب آتے رہتے۔

ایک دعا

جب سے ہوش سنبھالا تھا ہارٹ فیل ہونے کی بات سنتے آرہے تھے آہستہ آہستہ فیل ہونا جسم کے فیشن میں داخل ہوگیا۔ کڈنی فیل ہونے لگی۔ لیور فیل ہونے لگا اور تو اور پہلے دماغ خراب ہوتا تھا اب دماغ بھی فیل ہونے لگا۔

ہمارے ذہن میں اکثر آتا تھا کہ جب انسان ایک معمولی مشین بھی بناتا ہے تو اس کے کتنے Extra پرزے بھی تیار کرتا ہے اور اسکوٹر گاڑیوں کے ساتھ اسٹپنی اور Tool box تو کمپنیاں بھی دیتی ہیں اور اتنی بڑی دنیا بنانے والے سے اتنی بڑی چوک کیسے ہوگئی۔ اتنی Complicated مشین (انسان) بنادی اور ساتھ میں کوئی کل پرزے ساتھ نہیں کئے۔ بے چارہ انسان چاروں طرف ہاتھ پیر نہ مارے تو کیا کرے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ انسان کے جسم کی Opening کہیں پیٹ ویٹ میں ہوتی اور Zip کی طرح کوئی چیز ہوتی جو اسکو کھولتی بند کرتی۔ اس میں ایک ایسا System ہوتا جیسا تجوری میں ہوتا ہے۔ اور وہی انسان اس Combination کو جانتا جس کا جسم ہوتا۔ تاکہ دوسرے اس کی اعضا کی

چوری نہ کر سکتے۔ مثلاً بائیں ہاتھ کی ۳، ۴ انگلیوں کو چار بار ہلاؤ پھر داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پھیلاؤ ایک آنکھ دباؤ اوپر کا ہونٹ ذرا اوپر اٹھاؤ داہنے پیر کے انگھوٹے اور بائیں پیر کی چھوٹی انگلی کو تین بار جنبش دو تو کسی خاص انسان کے جسم کا پیٹ بیچ سے کھل جاتا ساتھ میں Box ہوتا اس میں کچھ Extra اعضا ہوتے اور اگر ضرورت ہوتی تو ان کو بدل دیتے۔ اسی طرح سر کے پچھلے حصہ سینے و پیٹھ پر الگ سے آنکھیں فٹ کرنے کا انتظام ہوتا تا کہ جب ضرورت ہوتی تو وہاں لگادی جاتیں اور سر کو بھی Dismantle کر کے اس کی دیکھ بھال کر لی جاتی۔ اچھا خاصا انسان خود اپنا علاج کر لیتا۔ اور ہندوستان کے دیہاتوں کے لوگ ڈاکٹروں کی قلت سے نہ مرتے نہ جھولا جھاپ ڈاکٹروں کا شکار بنتے۔ اعضا کو ٹھیک کرنے والے میکینک ہوتے۔ خراب اعضا کو ان کے پاس چھوڑ دیا جاتا تا کہ Repairing ہو سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج Third World میں ہسپتالوں کی کمی نہ کھلتی۔ بچے کے پیدا ہوتے وہ Zip دیکھی جاتی کہ صحیح سلامت ہے یا نہیں وہی اس کی زندگی کی ضامن ہوتی۔

لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ خدا چھپ چھپ کر ہمارے ذہن پڑھتا رہتا ہے اور اپنا خواب پورا ہوتے دیکھ لیا جب یہ خبر پڑھی کہ اب ڈاکٹر ہر طرح کے اعضا اسی عضو کے Cell سے Develop کر سکتے ہیں۔ چلو اچھا ہوا جو بھول خدا سے ہوگئی۔ اسے انسان نے سدھار لیا۔ کہاں سے انسان ناشکرا ہے۔ کتنے تو امداد باہمی کے جذبات اپنے اندر رکھتا ہے۔ یقیناً خدا کا رویہ انسان کے

یہ سچ ہے

لئے اور نرم ہو جائے گا۔ اب ہوگا یہ کہ جب بچہ پیدا ہوگا تو سب سے پہلے ماں باپ بچے کے جسم کے ہر عضو کے Cell بھی دیں گے او Stem cell بھی اسپتال کے لاکر (Locker) میں رکھ دیں گے۔ ورنہ بڑے ہو کر بچے یہ طعنہ دیں گے۔ کیا کیا آپ نے ہمارے لئے دل گردے وغیرہ کے Cell تو Preserve نہ کروا سکے اب ہم لوگوں کو کتنی مشکلیں جھیلنی پڑیں گی۔

ادھر جانوروں کے بعد آدمی کے کلون کی باری ہے۔ اب صاحب اگر اسی شکل وصورت مزاج وخصوصیات کا ایک انسان اور بھی موجود ہو گیا جسے آپ آج تک سامنے سے آئینے میں دیکھتے آئے ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں آپ کا کچھ بھلا ہو جائے گا؟ بھیڑ کی کلوننگ کریئے یا بکری کی اس سے غذا کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ گوشت کے دام گریں گے اور خدا نظر بد سے بچائے سبزی خور بھی گوشت خور ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کا کلون آپ کے لئے کیوں قربان ہوگا بلکہ ہر وقت آپ کی ہی زندگی کو خطرہ لاحق رہے گا۔ اپنی زندگی بچانے کے لئے پتہ نہیں کب آپ کا ہی خاتمہ کر دے۔ یا آپ نے بڑے داؤں پیچ یا بڑی محنت سے کسی لڑکی کو اپنے عشق میں گرفتار کر لیا وہ آپ کو ٹوٹ کر چاہتی ہے لیکن اس کو آپ کا ہمزاد مل گیا جو آپ سے بھی زیادہ Fresh اور تر وتازہ ہے۔ اور وہ ادھر ہی متوجہ ہو گئی۔ آپ تو اس سے بے وفا ہونے کی بھی شکایت نہیں کر سکتے۔ اس کا فوراً جواب ہوگا۔

''ارے وہ تم سے الگ کہاں۔ دو جسم ایک جان ہی تو ہو''

پھر ہمارے اپنے کھانے پینے کی قلت ہو رہی ہے۔ میاں کلون کو کیا کھلایئے گا۔ آپ کی روزی روٹی میں بٹوارہ کر لے گا اور ہندوستان کے مسائل تو دوگنے ہو جائیں گے۔

اب Genes کی الٹ پھر کر کے ایسا کر سکیں گے پیدا ہونے والے بچے میں ساری اچھائیاں ہوں۔ اور ہو سکتی ہے ایک دن ایسا آئے کہ دنیا میں ہر طرف خوب صورت لوگ نظر آئیں۔ گورے چٹے نکھ سکھ درست۔ پیار کرنے والے اور اگر غلطی سے کہیں کوئی آج کے حساب سے بدصورت پیدا ہو گیا اور دنیا کی یک رنگی سے پریشان ہو گئے، تو سوچئے صورت حال کیا ہو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماں باپ نے بڑی محنت سے الٹ پھیر کروا کر ایک آئیڈیل بچے کو جنم دیا اور اسے اپنے ماں باپ کی پسند کی ناک ہی پسند نہ آئے لیجئے صاحب آپ کی ساری محنت پر پانی پھر گیا۔ طعنہ الگ "آپ لوگوں کا Aesthetic sense کتنا خراب تھا۔ یہ کون سی ناک بنوادی میرے لئے ایک کام چھوڑ دیا آپ سے ماں باپ کا فرض بھی نہ نبھایا گیا۔ اور اوپر والا بھی خوب ہنسے گا۔ مسکرائے گا خوش ہو گا" اور اڑاؤ میاں خدا کی خدائی میں ٹانگ تمہارا بچہ تمہاری ٹانگ گھسیٹ رہا ہے"۔

نہ بابا نہ ہمارا اعضا اور ToolBox والا خیال ہی صحیح تھا اے اللہ تو بس اتنا ہی کرم کر دے۔

حق بہ حق دار رسید

جب سے سنا ہے مسٹر باسط امریکہ سے آرہے ہیں۔ ہر طرف ہلچل اور چہل پہل ہے مجھے تو یہ ہلچل پورے شہر میں نظر آرہی ہے۔ پورے شہر میں ہی کیوں پورے دو پردیشوں میں۔ایک وہ پردیش جس میں مسٹر باسط کے رشتے دار رہتے ہیں اور ایک وہ پردیش جس میں مسز باسط کے رشتے دار رہتے ہیں میں کون ہوں؟ یہ تو بتادوں! میں اس مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتی ہوں جس میں مسٹر باسط آرہے ہیں۔وہ امریکہ سے آئیں گے ۵/دن ٹھہریں گے اور پھُر ہو جائیں گے۔ یہ گھر ان کے سالے مسٹر ولی کا ہے اپنے اس سالے پر مسٹر باسط کو پورا اعتبار ہے کیونکہ وہ ان کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مسٹر باسط کا جب بھی فون آتا ہے وہ اپنی خواہش بعد میں بتاتے ہیں سالے صاحب ہنکاری پہلے بھرتے ہیں کام پورا کرنے کی۔ان کو سراپا خادم نے فون پر بات کرتے وقت بھی چہرے پر مسکینت کے تاثرات پیدا کرنے میں ان کے ہونٹوں کو بیڈھب ہوتے میں نے تین بار دیکھا ہے۔ہر بار اس خاص تاثر کے ساتھ اور اس محاورہ کی مخالفت کرتے ہوئے ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف۔

مجھے ایسا احساس ہوتا تھا کہ ان کو اپنے بہنوئی سے یقیناً بہت مدد ملتی ہوگی تبھی یہ خاکساری ہے۔ لیکن تیسری بار جب میرے سامنے پھر فون آیا اور مسٹر ولی کے چہرے کو لقوہ زدہ ہوتے دیکھا تو میں برداشت نہ کر سکی۔ ان کی بیگم جو میرے قریب بیٹھی ہوئی تھیں ان سے آہستہ سے پوچھا "لگتا ہے آپ کے نندوئی آپ لوگوں کا بہت خیال رکھتے ہیں"

"وہ چونک پڑیں" وہ ہم لوگوں کا خیال رکھتے ہیں یا یہ ان کا خیال رکھتے ہیں
میں نے اس جملے کو اپنے دماغ کے کئی حصوں میں بھیجا پر کہیں حل نہ نکلا۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میری نند Remote Control سے شوہر اور بھائی سب کو Control میں رکھتی ہے تاکہ وہاں بھی آرام سے رہے اور یہاں بھی ایک خادم اس کی خدمت پر معمور رہے۔"

میں کچھ پھر بھی نہ سمجھ سکی لیکن خاموش رہی۔ تو صاحب وہی آرہے تھے اور بار بار ادھر سے فون آتے ان کے آنے کی تاریخ پوچھی جاتی ساتھ ساتھ خیریت بھی۔ مسٹر ولی اپنی بیگم سے جب پوچھتے کس کا فون ہے اور وہ نام و شہر کا نام بتاتیں تو اس طرح تقریباً! مجھے سترہ اٹھارہ شہروں اور کئی محلے کے نام سنائی دیتے تو مجھے ہلچل کا احساس ہوتا تھا۔ مسٹر باسط کے آنے سے کچھ دن پہلے سے ہی ولی صاحب کے یہاں ان کے رشتہ داروں کا آنا شروع ہو گیا۔ پہلے مسٹر باسط کی ماں بھائی۔ بہن بہنوئی بھانجے بھانجیاں۔ بھتیجے بھتیجیاں، پھر مسٹر ولی کے

رشتے داروں کا آنا شروع ہوا۔ ان کی بھی بہن اور بھابھی کا خاص رتبہ تھا تیاریاں بڑے زور وشور سے چل رہی تھیں۔ پورے گھر کی Distempering ہو چکی تھی۔ باتھ روم میں پھر سے Tiles لگوادئے گئے۔ میں مسڑولی سے معلوم ہوا تھا کچھ تھوڑا بہت چھنٹا چھنٹا یا معمولی سامان مسٹرولی کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا تھا جس کو وہ انتہائی ممنونیت اور سراپا تسلیم ورضا ہو کر قبول کرتے تھے۔ واقعی کمال کی وفاداری تھی لوگ کروڑوں کا مال کھا جاتے ہیں اور ڈکار لینا تو دور ہمیشہ مجبور و بھوکا رہنے کا ڈھونگ کرتے ہیں۔ اور یہاں مسٹرولی چند سستے کپڑے اور الکٹرانک کے پرانے مال کو پاکر کس قدر خوش رہتے تھے۔

ایسے وفادار لوگ کہاں ملتے ہیں۔ مسز ولی ایک Working Women ہیں۔ کم بولتی ہیں، کم کھلتی ہیں، کم گھلتی ملتی ہیں، تھاہ ہی نہیں ملتی، چہرہ آئینہ ہوتا ہے۔ پر اس آئینے کی آب ایسی مرگئی تھی کہ کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔

مسٹرولی اپنے بہنوئی کو لینے دلی چل دئے۔ ان کے پاس بانٹنے کا بہت سامان ہوگا اور مزدور کی ضرورت۔ قلی چہرے سے سب جان لیتے ہیں پھر سامان کی راستے بھر دیکھ ریکھ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے ساتھ ایک مزدور تھا دوست لے کر چلے۔ دلی تک کا سفر ہوائی جہاز سے تھا پھر وہاں سے ٹرین A.C.I میں تین لوگوں کو سفر کرنا تھا۔ سارے انتظامات مسٹرولی نے کر لئے تھے۔ مسز ولی عجیب صورت میں نظر آرہی تھیں۔ میری تو کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی۔ بس ان کے ساتھ لگی رہتی کہ اس جم غفیر کے انتظام میں کچھ کوتاہی

نہ ہو جائے۔ فریج پھلوں اور کچن میوے وطرح طرح کے بسکٹوں سے بھرا تھا۔
اسپیشل Varities شروع ہو چکی تھیں۔ مسز ولی آج کل روز دیر سے آفس جاتی تھیں۔ بچاری جانے کیسے تال میل بٹھا رہی تھیں۔

دوسرے دن مسٹر ولی اکیلے ہی واپس آئے تجسس تو مجھے بھی تھا میں نیچے اتر آئی۔ حال پوچھنے لگی ان کے رشتہ داروں میں عجیب بے چینی اور مایوسی تھی۔ مجھے کسی انہونی کا شبہ ہوا۔ جب رونے کی کوئی آواز نہیں سنائی دی تو مجھے اطمینان ہوا۔ پھر بھی بڑی بے چینی کا عالم تھا۔ مجھے لگا شاید مسٹر باسط نے آنے کا ارادہ ترک کر دیا ہوگا اسی لئے سب مغموم ہیں کہ اتنے دنوں بعد ملنے کی امید بندھی تھی۔ وہ بھی ختم ہوگئی۔ میں چند پچکارنے والے جملے ذہن میں گڑھ رہی تھی کہ مسٹر ولی کی بہن کی مہین آواز ابھری۔

''تو بھیا کیا سارا سامان غائب ہوگیا۔'' ان کے چہرے پر شبہے کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔

''نہیں بھائی غائب نہیں ہوا بلکہ پلین سے ہی کسی دوسری جگہ چلا گیا ہے رپورٹ کر دی گئی ہے۔ مل جائے گا۔''

''کب ملے گا''

یہ کوئی دوسری آواز تھی۔

''اب یہ تو وہی لوگ بتا سکیں گے۔''

''پتہ نہیں ملے گا بھی کہ نہیں۔'' ایک مشکوک سے آدمی کی آواز تھی۔

''ملے گا کیوں نہیں؟ کوئی بس یا ٹرین میں چھوٹا ہے نہیں ملے گا۔'' مسٹر ولی کھسیاسے گئے۔

''اب پتہ نہیں کتنے مہینے میں ملے گا اور باسط میاں کے پاس واپس جائے گا یہاں کیوں آئے گا۔'' یہ ایک بزرگ حضرت تھے۔

''وہاں کیوں جائے گا یہاں کے نام سے ہے۔'' مسٹر ولی بولے۔

''تو بھیا تمہیں ہی پتہ چل جائے گا ہمیں تو نہیں'' یہ بھی ایک مرد تھے۔ ایسی دلیلیں مرد ہی دے سکتے ہیں۔

سب کے چہرے پر بس ایک ہی طرح کا تاثر تھا کہ سیدھی بات یہ ہے کہ اب تم ہی سب کچھ پا جاؤ گے۔ اور بچو کیا پتہ تم نے ہی اس لئے غائب کروایا ہو کہ سب کا حصہ تم پا جاؤ۔

میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی میں تو سنتی آرہی تھی کہ مسٹر باسط آرہے ہیں لیکن اب تو یہی لگ رہا تھا کہ آنے والا دان پن کا سامان تھا۔ جس نے شاید آنے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ یا پھر اسے مسٹر ولی نے اغوا کرلیا ہے۔

''لیکن باسط صاحب کیوں چلے گئے؟'' یہ مسز ولی تھیں پہلی بار مسٹر باسط کا نام سنا تو لگا نہیں ان کا بھی ذکر ہو سکتا ہے۔

''اصل میں ان کو ایک ضروری کام نوئیڈا میں تھا اس لئے وہ کام کر کے کل صبح آئیں گے۔''

یہ سن کر صرف مسز ولی کے چہرے پر سکون نظر آیا۔ باقی لوگوں کے لئے

خبر نا قابل اعتبار رہی۔

دو چار باتیں کر کے میں اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور سوچتی رہی واقعی مادہ کی کتنی اہمیت ہے۔ یہ سب مذہب کے ماننے والے ہیں۔ خود جس مادے کی برائی کرتے ہیں اسی کے چاروں طرف ناچتے رہتے ہیں۔ اور اس کے منکر بھی رہتے ہیں۔

دوسرے دن مسٹر باسط آئے اور پانچ دن رہے بھی لیکن جب تک ان کا سامان واپس نہ ملا تب تک ہر شخص سامان کے لئے فکر مند تھا۔ صرف ایک مسز ولی تھیں جن کے منھ سے میں نے سامان کا کوئی ذکر نہ سنا وہ صرف اس بات کا دھیان رکھ رہی تھیں کہ مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو پھر انھوں نے تین دنوں کی چھٹیاں بھی لے لیں دو دنوں کے بعد سامان لے کر مسٹر ولی کے دوست بھی دلّی سے واپس آ گئے۔ اور اس دن میں نے سبھوں کے چہرے پر جو رونق دیکھی اس کا جواب نہیں۔ ہر کوئی مسٹر باسط کے ارد گرد تھا۔ وہ سامان کھول کر بانٹ رہے تھے ۔ ہر شخص اس چالاکی میں تھا کہ کتنا کچھ نہ پا جائے۔

مسٹر باسط کو سامان بانٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ صرف مسز ولی کچن میں تھیں۔ اور مسٹر ولی شیروں سے دور بیٹھے گیدڑ کی طرح اپنے حصے کا انتظار کر رہے تھے۔

ڈسپلن اور قانون

راج درباروں کا عہد گزر چکا تھا اب تو جنتا کا راج ہے۔ جنتا اپنے نمائندے چنتی ہے۔ وہی جنتا پر خدمت کے نام پر حکومت کرتے ہیں راج جنتا کا چنے نمائندے جنتا کے لیکن سب الگ خیالات کے۔ پوری جنتا ووٹ دیتی ہے لیکن چھوٹے راجیہ تو ابھی موجود ہیں۔ وہی لڑنے کا طریقہ۔ یہ تیرا ہے۔ یہ میرا ہے۔تو میرا کیسے لے گا۔لیکن میں تیرا ضرور لے لوں گا۔ دیکھتا ہوں کیا کر لیتا ہے۔راج لیکن جنتا کا ہے۔آزادیٔ خیال، آزادیٔ مذہب، آزادیٔ اظہار لیکن ہر ایک آزادی کی حدیں بہت پھیلی ہوئی ہیں۔بس یہ سمجھ لیجئے کہ دائرے بڑے بڑے ہیں اور ایک دوسرے کے اوپر پھیلے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی حدوں کو جکڑے ہوئے ہیں۔ایسے ہی ایک راجیہ کا سربراہ اپنی جنتا سے مخاطب تھا اس کا کچھ دنوں پہلے قبضہ ہوا تھا۔باگ دوڑ سنبھالنے کے کچھ ہی دنوں بعد اس نے اپنے درباریوں کو بلایا۔ایک ایک سے پریچے کے لئے۔

اس نے بڑی میٹھی زبان میں باتیں کیں۔لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔وہ ہر ایک سے جھک کر ملا۔درباریوں نے واہ واہی کی۔واقعی اس جیسا

سربراہ کبھی نہ آیا پھر اس نے ایک رسمی تقریر شروع کی۔

''میں اس جگہ اس لئے نہیں بیٹھا ہوں کہ مجھے کرسی کا شوق ہے۔ مجھے یہاں اس لئے آنا پڑا کہ اس Institution کی حالت خراب ہے۔ مالی طور پر تنگی ہے۔ لوگوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ میں کبھی دوسروں کی بتائی باتیں نہیں سنتا خود تحقیق کرتا ہوں۔

وہی کروں گا اس کو سدھاروں گا۔ میں آپ کا حاکم نہیں خدمت گار ہوں۔ آپ لوگ میری مدد کیجئے گا''

ہال تالیوں سے گونج اٹھا ہر طرف واہ واہی تھی اس کی تعریف تھی ۔درباری خوش تھے۔ کچھ دن نہ گزرے تھے کہ اس نے تعمیری کام شروع کروادیئے۔ درباریوں کی کئی کمیٹیاں تیار کیں۔ مالی تنگی کے باوجود کمیٹیوں کو پیسے دئے جانے لگے۔ کسی نے بھی سوچنے کی زحمت گوارہ نہ کہ مالی تنگیوں کے باوجود کمیٹی کے اخراجات اور تعمیری کام کیسے پورے ہورہے ہیں۔ ہر کمیٹی میں کام کرنے والا اور پیسے پانے والا اس کا حمایتی بن گیا زیادہ تر درباری اس کے حمایتی بن گئے تب اس نے پھر ایک دن سبھی درباریوں کو مدعو کیا خاطر تواضع کی۔ پھر تقریر شروع ہوئی۔ آج اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا اب تک وہ ہر ایک کی کمزور نسوں پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔

''میرے درباریو اور عمل بردارو۔ میں نے آپ سب کو اس لئے بلایا ہے کہ اب تک جو بھی سربراہ آتے وہ بدکردار اور بدعمل تھے۔ اسی لئے انھوں نے

اس Institute کو بگاڑا۔ جتنے شعبے تھے سب جگہ غلط لوگوں کو رکھا ہر طرف برائی ہی برائی ہے وہ رکا اور نظر درباریوں پر ڈالی کئی چہروں پر بے چینی دیکھی پھر گویا ہوا۔

"لیکن آپ کو سدھارنا ہے میں کسی بات کی پرواہ نہیں کروں گا۔ کسی رشتے اور کسی قسم کے تعلقات کی پرواہ نہیں۔ ہر شعبے کے سربراہ کو دوسروں کے لئے قربانی کرنی ہوگی۔ سدھارنا ہوگا دوسروں کا خیال رکھنا ہوگا جو کمزور ہے اس کی مدد کرنے کی ہوگی۔ قربانی ضروری ہے۔ کسی کرسی کی خواہش سے پرے ہٹنا ہوگا"

انھوں نے بہت سے فرائض بتائے جو درباریوں کے لئے تھے لیکن انھوں نے اپنے فرائض نہیں بتائے۔ تبھی ناشتہ وغیرہ پیش کیا جانے لگا ناشتہ لگانے والے نے جانے یا انجانے میں پہلے ان کے سامنے پلیٹ نہ رکھ کر ان کے دائیں طرف بیٹھے درباری کو بڑھا دی۔ ہم نے دیکھا سب نے دیکھا انھوں نے ناشتہ لگانے والے کو خشمگیں آنکھوں سے دیکھا وہ گھبرا گیا درباری سمجھ گیا اس نے ناشتہ لگانے والے سے کہا "پہلے صاحب کے سامنے ناشتہ رکھو" اس سے پہلے ہی سربراہ صاحب بول پڑے "ڈسپلن نام کی کوئی چیز یہاں ہے ہی نہیں اس کے بارے میں انکوائیری کروں گا ضرور اس کے تقرر میں کوئی کھوٹ ہے۔" یہ کہتے ہوئے بھول گئے کہ ابھی انھوں نے کمزوروں کی مدد کرنے اور دوسروں کے لئے قربانی کرنے کی تلقین کی تھی۔ اور ابھی اپنے لئے لاٹ صاحبی کا قانون مقرر کر لیا۔

سمجھوتہ

چوڑی چوڑی سڑکیں صاف ستھری اور چکنی۔ سڑکوں کے دونوں طرف جگہ جگہ اونچے پیڑ۔ زیادہ تر گل مہر کے لیکن کہیں نیم اور سہجن کے پیڑ بھی نظر آجاتے تھے۔ چاروں طرف ہریالی، الگ الگ Rank کے لوگوں کے علاقے، اور ہر علاقے میں ہریالی۔ لیبر کلاس کے کواٹروں کے آگے بھی کچی اور اچھی خاصی زمین ان لوگوں کو مہیا ہوتی ہے۔

دوسرے کوارٹر عام طور پر بہت بڑے گراؤنڈ کے چاروں طرف بنے ہوتے ہیں۔ ہر کوارٹر کے آگے کچی زمیں ہوتی ہے یعنی ایک احاطہ سا بھی جس میں کہیں پھلوں کے پیڑ اور باغیچہ، کہیں صرف باغیچہ اور اگر زمین زیادہ مل گئی تو سبزی وغیرہ بھی اگائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ان کوارٹروں کی زمینوں پر اپنے موسم میں گنے اور مکئے کے پیڑ بھی دکھائی دئے جاتے ہیں۔

گنگا سے نکلی ایک نہر بھی اس علاقے سے بہتی ہے جو الہ آباد تک جا کر پھر گنگا میں مل جاتی ہے۔ ابھ بھی اس نہر سے مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ یہ علاقہ کانپور کے جس حصے میں بسا ہے اسے ارما پور کے نام سے جانا جاتا ہے جو کئ

کلومیٹر کے علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں کانپور کی Ordanance
Factory ہے۔ کالپی روڈ کے ایک طرف فیکٹروں اور دوسرے طرف ارماپور کالونی جس میں پینتیس چالیس ہزار کی آبادی۔ اس میں طرح طرح کے طبقے کے لوگ بسے ہیں۔ ارماپور دن کے زیادہ حصے میں سناٹے میں ڈوبا رہتا ہے۔ صبح پونے سات سے سوا سات بجے تک اور شام کو سوا پانچ سے پونے چھ بجے تک کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ دن کے سارے سناٹے کا قرض ادا ہو جاتا ہے۔ سائیکل اور دو پہیہ گاڑیوں کی ایسی بھیڑ رہتی کہ سڑک پار کرنا مشکل ہو جانا ہے ایسے وقت پر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کبھی یہاں پر سکون ماحول بھی ہوتا ہوگا۔

اس علاقے میں نہ جگہ جگہ دوکانیں ہیں۔ نہ ہوٹل۔ کسی کسی جگہ پر ایک دو پر جون کی دوکانیں دکھائی دے جاتی ہیں۔ نہ کوئی سبزی کا ٹھیلہ کبھی کبھی پھلوں کے ٹھیلے تیزی سے گذرتے ہوئے ضرور دکھائی دئے جاتے ہیں جن کا مقصد تیزی سے فیکٹری کے گیٹ تک پہنچنا ہوتا ہے جہاں لنچ کے وقت ایک جم غفیر پھلوں کو خریدتا اور کھاتا ہے اور کالپی روڈ سے گذرنے والے بھی ان پھل والوں سے کافی پھل خرید لیتے ہیں۔ یہاں کی اپنی ایک زندگی۔ ایک چھوٹا سا بازار ہے اور ایک بڑا بازار۔ عجیب ستم ظریفی کہ جسے چھوٹا بازار کہتے ہیں وہاں دن کے تین بجے سے رات دے دس بجے تک اتنی دکانیں لگتی ہیں اور اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔ قریب کے دیہاتوں سے لائی تر و تازہ سبزیوں سے لے کر ایک سے ایک بڑھ کر خونچے والے۔ کپڑے جوتوں چپلوں سے لے کر زندگی کی ہر چیز

مہیا۔ ارماپور میں رہنے والے لوگ جب کوئی Special چیز لینی ہوتی ہے تبھی شہر جاتے ہیں۔ ارے ہاں بڑا بازار۔۔۔ اس میں کچھ دوکانیں ہیں جو دن بھر کھلی رہتی ہیں ان میں دو ایک دکانیں مٹھائی کی اور ایک ہوٹل۔ جنرل مرچنٹ کی دوکان ایک ڈاکٹر جو ہومیوپیتھی کا بھی ہوتا ہے (ارماپور کا اپنا ایک سرکاری اسپتال بھی ہے) راشن کی دوکان اور ایک چپل و جوتوں کی دوکان یہ ہے بڑا بازار۔

یہاں کانپور کی شہری زندگی سے بالکل جدا زندگی و حالات ہیں۔ نہ گہما گہمی، نہ گندگی، نہ بدبو، نہ بھیڑ بھاڑ، نہ فیکٹری میں کام کرنے والوں کو فرصت، سنیچر کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی ہے جو اکثر پورے Working Day میں بدل جاتی ہے کیونکہ Overtime لگ جاتا ہے۔ اکثر اتوار کی چھٹی بھی Overtime کی نذر ہو جاتی ہے کہ پیسے سے بڑھ کر دنیا میں کیا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ Social Life کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں۔ اگر Social Life ہے تو صرف اتنی کہ ایک جونیر کلب ہے جہاں زیادہ تر تاش کھیلا جاتا ہے اور آفیسرز کے لئے سینیر کلب جہاں ایک سویمنگ پول، بیڈمنٹن کا کورٹ اور ٹیبل ٹینس کی سہولیت بھی رہتی ہے، جہاں ہفتے میں ایک بار ڈنر بھی رکھا جاتا ہے۔

جگہ جگہ بڑے بڑے گراؤنڈ جن میں بچوں کو کھیلنے کے لئے کافی جگہ ہوتی ہے۔ کوارٹر کچھ تو نئے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو انگریزوں کے زمانے کی Barracks ہیں جن کو کوارٹروں مین بدل دیا گیا ہے۔ گرمیٹڈ آفیسرز کے اکثر بنگلو اونچی اونچی چھتوں والے ہوتے ہیں جن میں فائیر پلیس بھی موجود ہوتے ہیں

بنگلو کے چاروں طرف تین چار بیگھہ زمین ہوتی ہے۔ جن میں پھلوں کے پیڑ کے ساتھ کافی زمین ہوتی جس میں اکیثر آفیسرز کھیتی بھی کرواتے ہیں اور ساتھ ہی پھول پودے لگے رہتے ہیں۔ ان بنگلوں کے ساتھ دو سرونٹ کوارٹرز بھی ہوتے ہیں کالونی کی زندگی کئی معنوں میں شہروں کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ زندگیاں تو ہر جگہ کہانیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ یہاں بھی ہزاروں کہانیاں اور گردار فضا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اندا بھی جدا جدا ہوتے ہیں لیکن لوگوں کو ان پر سر کھپانے کی شاید فرصت نہیں۔

سرونٹ کوارٹرز کا بھی اپنا سماج ہے۔ ایک جدا سماج۔ بنگلوں کے آفسرز کا تو تبادلہ ہوتا رہتا ہے لیکن سرونٹ کوارٹرز میں زیادہ تر ایسے خاندان رہتے ہیں جن کی دو تین پشتیں وہیں گذر گئی جہیں۔ ان میں کچھ ترقی کر کے آگے نکل جاتے ہیں تو کچھ دوسرے پریوار آ کر رچ بس جاتے ہیں۔ ان کوارٹر کے لئے انہیں پیسے نہیں دینے ہوتے بلکہ مزدوری ادا کرنی پڑتی ہے۔ عام طور پر ایک کوارٹر مالی کو دیا جاتا ہے اور دوسرا ایسے پریوار جن کی عورتیں گھر گھر میں کام کرنے جاتی ہیں۔ پہلے وہ صاحب کے گھر کا جھاڑو پونچھا اور برتن کرتی ہیں پھر وہ دوسرے گھروں میں کام کرنے جاتی ہیں۔ مالی باغبان سے لے کر کھیتی باڑی تک کرتا ہے اور آدھی فصل کا حقدار ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کے گھر کی عورتیں بھی گھر کا کام کرتی ہیں اور صاحب کے بنگلو میں تو ان لوگوں کو بہت سے کام ہوتے۔ ان میں صاحب سے قربت حاصل کرنا بھی ایک کام ہے۔ اور صاحب بھی زمینداروں کی طرح اپنی

اپنی رغبت ہی نہیں بلکہ ملکیت بھی سمجھتے ہیں۔ ذہنی لگاؤ سے لے کر جنسی لگاؤ تک سب جائیز۔

ویسے بھی ہمارے ہندوستانی سماج میں مرد کی یہ نفسیات تو ہر جگہ قائم رہی ہے۔ ایک عدد بیوی جو بستر کی رفیق کھانا کپڑا اپانے حقدار۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ گھوما جا سکتا ہے لیکن ہمیشہ و ہر جگہ نہیں۔ اس سے گھر مسائل پر تبدیل خیالات کئے جا سکتے ہیں بچوں کی تعلیم و تربیت پر گفتگو ہو سکتی لیکن دل کا ایک کونہ ضرور خالی ہونا چاہئے جس میں دوسری عورتیں آتی جاتی رہیں۔ اور بیوی کی جوڑی سے جو سکھ وہ دوسرے عورتوں کی رفاقت سے حاصل کرتا ہے اور جو کچھ وہ ان کو دیتا ہے اس کا مزہ تو کچھ اور ہی ہوتا ہے اس مزے کا ہر مرد لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ اور اگر حالات سازگار ہوں تو کیا بات ہے! تو جناب صاحب لوگوں کے لئے یہاں ہمیشہ حالات سازگار ہی رہتے تھے۔ میم صاحب لوگ لاکھ نظر رکھ لیں ایسے آدان پردان یہاں ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ میم صاحب کو ان پر Depend ہونا ہی پڑتا ہے کہ کبھی انہیں رشتے داری میں جانا پڑتا ہے کبھی گھومنے پھرنے اور یہ Under Currents ہمیشہ برقرار رہتے ہیں۔

کہانیاں تو ارما پور میں بھی جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں لیکن آج ایک خبر پڑھی تو اسی سے ملتی جلتی ایک کہانی مجھے بھی یاد آ گئی۔

یہ بات تو طے ہے کہ نچلے طبقے میں قدروں کے نہ ہونے سے ہر طرح کی آزادی رہتی ہے۔ حالات کے مطابق جوان کے لئے فائدہ مند ہے وہ سب

ٹھیک ہے۔ دیہاتوں میں پنچایتیں وغیرہ بھی ہوتی ہیں جو کچھ پابندیاں بھی عائد کرتی ہیں لیکن شہروں میں ہر طرح کی آزادی ہے۔ جلسم کی کوئی عزت نہیں۔ کوئی قیمت نہیں۔ پھر جہاں پیٹ بھرنے کے لئے مشکلیں ہوں تو وہاں کون سی قدریں باقی رہ سکتی ہیں۔

ایسا ہی ایک بنگلو میرے شوہر کو ملا تھا۔ ہم لوگ بڑی چھٹیوں میں وہیں چلے جاتے تھے اور پھر دنیا کو بھول جاتے تھے۔ سناٹا، خاموشی، رنگ برنگی پڑیوں اور کتا، بلّی، گلہری، نیولے، سانپ، گائے، بکری، اور سور کے علاوہ دن میں دو تین وقت سرونٹ کوارٹرز سے آنے والی عورتیں ہوتی تھیں۔ یا پھر صبح شام مالی آتا تھا۔ میرے یہاں بھی ایک کوارٹر میں گھر کام کرنے والی گیتا اپنے شوہر و بچوں کے ساتھ رہتی تھی اور ایک میں مالی، چونکہ میرے شوہر اکیلے رہتے تھے اس لئے گیتا کھانا پکاتی تھی جس کے لئے اس کو تنخواہ دی جاتی تھی کیونکہ یہ کام اس کے بے گار میں شامل میں نہیں تھا۔ مالی کے پریوار میں اس کی بیوی دو لڑکیاں اور ایک بڑا بھائی شامل تھا جو بیمار تھا۔ شاید اسے دق تھی۔

گرمی کی چھٹیاں تھیں۔ جامن بھی پکنے لگی تھیں اور آم بھی خوب پھلا ہوا تھا۔ امرود کے پیڑوں میں بھی پھول آنے لگے تھے۔ حالانکہ امرود کو ہم لوگوں کو کبھی کھانے کو نہیں ملے۔ وہ زیادہ تر کچے ہی کھاتے تھے لیکن جامن کے دونوں پیڑوں میں

بے انتہا جامن پھلتے تھے اور بہت لذیذ ہوتے تھے۔ آم بھی کافی گودے دار ہوتا

تھا اور پکنے پر بہت میٹھا ہوتا تھا۔ لیکن برا ہوا اس کھلے علاقے کا جو ہوائیں شہروں میں صرف تیز ہوائیں ہوتی ہیں وہ ارما پور میں آندھی بن جاتی ہیں جس میں کافی آم ٹوٹ کر گر پڑتے تھے اور پھر شروع ہوتی تھی۔ سرونٹ کوارٹر کے باسیوں کی چھینا جھپٹی۔

گیتا اور اس کی فیملی تقریباً پانچ سالوں سے ہمارے کوارٹر میں رہ رہی تھی اور وہاں کے حساب سے میرے گھر کے بعد اور پانچ گھروں کے بعد اور پانچ گھروں میں کام کرتی تھی۔ ایک رواج تھا کہ جن صاحب کے بنگلو کے کوارٹر میں یہ Family رہتی تھی ان پر ان کے حق کا میدان کافی وسیع ہوتا تھا۔ چونکہ گیتا کافی دنوں سے کام کر رہی تھی اور محنتی وایماندار تھے اس لئے میرا رویہ اس کی طرف زیادہ ہمدردی سے بھرا تھا۔ مالی کئی بدلے گئے تھے۔ اور اب رام پرساد نیا مالی تھا۔ گیہوں کی فصل پیدا کر چکا تھا دھان کی تیاری میں تھا۔ بارش کا انتظار تھا۔ وہ لان اور پھولوں کی کیاریوں کی بھی بہت سلیقے سے دیکھ بھال کرتا تھا۔ کافی محنتی لگتا تھا۔ کچھ سبزیاں بھی لگا رکھی تھیں۔ چرب زبان بھی تھا۔ بیوی خوبصورت تھی اور اپنے خوبصورتی کا احساس بھی تھا اسے لیکن ماں باپ اور بچے بہت چالاک تھے جو مجھے بہت برا لگتا تھا۔ ان لوگوں کو پوری کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ پھل۔ سوکھی لکڑیاں اور سوکھی جھاڑیوں کو اپنے کوارٹر میں اٹھا لے جائیں۔ اس کی خامی کو بھی ہم لوگ اس لئے نظر انداز کر دیتے تھے کہ وہ لان اور باغیچہ صاف ستھرا رکھتا تھا۔ دنمیں وہ کہیں کام کرنے جاتا تھا۔ صبح وشام وہ مالی کے فرائض انجام دیتا

تھا۔ اس کا بھائی بھی اکثر کنارے آکر بیٹھ جاتا تھا اور سامنے سامنے کی گھاس صاف کرتا رہتا اور کھانستا رہتا۔ مالی نے اپنے بیمار بھائی کی پرورش کر رہا ہے اور بیوی بھی کوئی اعتراض نہیں کرتی اس بات سے میں بہت متاثر تھی کہ بھائی بھائی ایک دوسرے سے نہیں نباہ پاتے اس مالی کی بیوی اپنے جیٹھ کو بھی کھانا پکا کر دیتی ہے اور دیکھ بھال بھی کرتی ہے اس وجہ سے اس کی وقعت میری نظروں میں بہت بڑھ گئی تھی۔

ایک خیال اکثر میرے دماغ میں آتا تھا کہ یہ جانوں کہ آخر للّن (مالی کا بڑا بھائی) کیا ہمیشہ سے بیمار تھا یا اس کے بھی کہیں بیوی بچے ہیں۔ یا اس کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ ایک دن میں نے للّن سے پوچھ ہی لیا تو اس نے بتایا کہ اس کے بیوی بچے نہیں ہیں اور وہ پہلے ٹھیک تھا لیکن دس سالوں سے بیمار ہے۔ اس سے زیادہ پوچھنے کی میری ہمت بھی نہ ہوئی۔ بیماری نے اسے کمزور و بوڑھا بنا دیا تھا۔ وہ شاید موت و زندگی سے سمجھوتہ کر چکا تھا اور بس صرف زندہ تھا۔ میں اندر سے کانپ گئی۔ پتہ نہیں علاج بھی ہو پاتا ہے کہ نہیں وہ بھائی بھاوج پر منحصر تھا۔ اور مجھے ان لوگوں کی مالی حالت بہت اچھی نہیں لگتی تھی۔ للّن زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔

ایک دن شام کو گیتا آئی تو بہت غصے میں تھی۔ عام طور پر وہ ہمیشہ خوش رہتی تھی۔ اس کا آدمی کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا
مجھے لگا کہ کچھ اسی سے کہا سنی ہوگئی ہے میں پوچھا:

''کیا بات ہے گیتا؟''

''کچھ نہیں ماں جی! یہ رام پرساد کی عورت ہمیشہ ہم لوگوں کو پریشان کرتی رہتی ہے۔ ہمارے درواجے تک سب کچھ پھیلاتے رہتی ہے۔ دن میں ماں جی آپ سے پوچھ کر ہم سوکھی لکڑی لے گئے تھے۔ تب پر لڑ رہی تھی کہ چپکے سے اٹھالاتی ہو۔ یہ سب تو ہماری لکڑی ہے۔''

''تو تم نے بتایا نہیں کہ میں نے نہیں دیا ہے۔''

''ارے ماں جی آپ نہیں جانتیں۔ یہ عورت بڑی چھنسال ہے۔ دو دو مرد رکھے ہے اور کیسی بھولی بنتی ہے نہ شرم نہ لاج''

''دو دو مرد'' میں چونک گئی ''دوسرا مرد کون ہے؟''

''ماں جی یہ رام پرساد کی نہیں للّن کی عورت ہے۔'' گیتا نے کہا۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں بس ایک ٹک حیرت سے گیتا کو دیکھ رہی تھی۔

''رام پرساد کی عورت کو گاؤں میں پڑی ہے۔ للّن کی یہ عورت رام پرساد کے گھر بیٹھ گئی ہے''

میں سکتے میں تھی۔ کوئی کڑی نہیں جوڑ پا رہی تھی۔ رام پرساد نے اپنے بڑے بھائی للّن کی بیوی کو گھر بٹھا لیا تو پھر للّن اس کے ساتھ کیوں ہے؟ پھر مجھے احساس ہوا للّن اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ بیوی اس کی اس کے بھائی کے قبضے میں ہے ظاہر ہے اپنی مرضی سے ہی رہ رہی ہے وجہ للّن کی بیماری ہو سکتی

یہ سچ ہے

ہے للّن کے سامنے تو سب سے بڑا سوال بھوک ہے تو کہاں کی Ego اور کہاں کی Self Respect اور اوما۔ اس کے سامنے تو جسم اور پیٹ دونوں کی بھوک رہی ہوگی لیکن رام پرساد کے سامنے کیا تھا؟ اور پہلی بیوی کا کیا قصور تھا؟ سب کچھ گڈمڈ ہوتا رہا۔ یہ تو تثلیث بھی نہیں مربع تھا۔ جس میں صرف دو حصے سمجھ میں آرہے تھے۔ اور یہ حقیقت یوں ہی ان سلجھی کہیں دب گئی تھی کہ کل ایک خبر پڑھی کہ ۳ بچوں کی ۴۵ سالہ ماں نے ۶۵ اور ستر سال کے دو سگے بھائیوں کے ساتھ ایک ساتھ شادی کرلی۔ کیا ہمارا سماج بدل گیا ہے؟ یا پھر اس کے پیچھے روٹی کا سوال ہے؟ میں پھر الجھن میں ہوں اور کوئی سرا نہیں مل رہا ہے۔

☆☆☆

شاہ رخ اور سلطانہ جب گھر سے نکلے تو سلطانہ اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ اس جذبات کی رو کدھر چل پڑے گی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی بیٹی کے لئے فراک کا کپڑا لیا۔ ایک دوکان پر رک ٹافیاں لیں۔ ٹیلر کے پاس سے سلے کپڑے اٹھائے اور یہ سب کام حسب مطابق جلدی سے ہو گئے۔ اتنی جلدی جیسا کہ ہمیشہ ہوتا تھا کہ سلطانہ کے پاس بازار جانے کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا۔ دوکانوں پر جاؤ پسند کی چیز دیکھو خریدو، دام ادا کرو سامان اٹھاؤ اور گھر کو چل دو۔

بسکٹ ختم ہو گئے تھے بچوں کی فرمائش دو سہ لانے کی بھی تھی۔ ایک ریسٹوراں کے سامنے انہوں نے اسکوٹر کھڑی کی۔ سلطانہ نے نہ اندر جانا مناسب سمجھا نہ شاہ رخ نے کوئی اصرار کیا۔ وہ دوسے پیک کرانے چلا گیا اور سلطانہ گاڑی پاس ہی کھڑی اس کا انتظار کرتی رہی۔

دور سے اس نے دیکھا کہ شاہ رخ نے دوسے کا آڈر دیا اور پھر قریب کی بسکٹ کی دوکان پر چلا گیا۔ وہ دوکان دار سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ ''کاجو کے بسکٹ اچھے ہوتے ہیں'' ایک اڑتا سا خیال سلطانہ کے دماغ میں آیا'' شاید شاہ رخ

کا جو کے بسکٹ ہی لیں یا ہو سکتا ہے نہ لیں'' لیکن اس کا دل نہ چاہا کہ شاہ رخ سے
کہے کہ کا جو کے بسکٹ لے لو حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ کہتی تو شاید وہ یہی کرتا۔
لیکن اس نے بے نیازی سے سوچا جو چاہے لیں۔ ''کیا اس کو کسی چیز کی خواہش
نہیں ہوتی؟'' اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ ''ہوتی ہے لیکن شارہ رخ سے اپنی
کسی خواہش کی تکمیل کا دل آرزو مند ہی نہیں۔'' بس یہیں سے وہ خیالات کے
سمندر میں غرق ہوتی گئی اور دس منٹ میں جانے کتنی تصویریں ابھریں اور مٹ
گئیں۔

''ایسا تو نہیں کہ شاہ رخ اس کی بات ٹال دے گا لیکن نہیں اب دل ہی
نہیں چاہتا کہ اس شخص سے اپنی کوئی بات یا کوئی خواہش بتاؤں اور وہ اسے پورا
کرے یہ شخص میرا نہیں ہے پھر میں اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیوں کروں۔
میں تو صرف نباہ کر رہی ہوں اس لئے کہ یہ شخص میرے بچوں کا بات ہے اور میں
نہیں چاہتی کہ بچوں کو ان کے باپ سے دور کروں۔ سب کچھ برداشت کرتی رہی
اور اب بھی رہی ہوں۔

یہ کتنا اذیت ناک معاملہ ہے کہ جس کے ساتھ آنے جانے میں کوئی
خوشی نہ ہو۔ اور ہمیشہ بیچ میں کوئی پردہ حائل رہے اسی کے ساتھ زندگی کا سفر طے
کیا جاتے۔ میری غلطی کہاں تھی؟ کیا یہ پردہ میں نے تان رکھا ہے؟ نہیں! میں
نے تو شاہ رخ کو بھرپور پیار دیا وہ ہی کبھی اسے سمجھ نہ سکا۔ اور کتنی بڑی بے وقوف
تھی میں کہ یہ بات کہ یہ شخص نہ میرا ہے نہ میرا ہو سکتا ہے اس کو میرے ذہن نے

اس وقت قبول کیا جب میری زندگی صرف میری زندگی نہیں رہ گئی۔ ۱۷ سال کو شش کرتی رہی اور ہر بار ٹھوکر کھاتی رہی۔ ہر بار سوچتی کہ اب یہ شخص میرا ہو جائے گا اور ہر بار نئی ٹھوکر ملی۔ اور اب جب ذہن نے یہ یقین کر لیا ہے کہ یہ میرا نہیں ہو سکتا تو کتنا سکون ہو گیا ہے''۔

''شادی کے بعد میں بھی دوسری لڑکیوں کی طرح کہ سوچتی تھی کہ میر اشوہر میری محبت کا دم بھرے گا میرے ساتھ گھومے پھرے۔ ہم لوگ ساتھ جا کر گھر کی خریدار کریں گے۔ سنیما دیکھیں گے۔ شہر شہر گھومیں گے۔ لیکن یہ تب بھی نہ ہوا۔ ہر بار اس شخص نے احساس دلایا کہ اس کا مرکز کہیں اور ہے۔ اس نے مجھ سے بار بار کہا کہ میں اس سے یہ سب امیدیں نہ رکھوں۔ میں ہمیشہ اس پر یقین رکھتی رہی کہ بیوی وشوہر کے بیچ کوئی پردہ نہیں ہونا چاہئے۔ بے تکلفی اور صاف دلی ہونی چاہئے اور شاہ رخ نے ہمیشہ مجھ سے کہا کہ اس کے اپنے اور میان کے پردے کو چیرنے کی کوشش نہ کروں ورنہ میرا جینا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے بہت جتن کئے کہ وہ میری پر خلوص محبت کو سمجھ لے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے جس قدر قریب ہونا چاہا اس نے مجھے اسی قدر شدت سے جھڑکا۔ شاید ہم دونوں دوالک الگ کرّوں کے باشندے ہیں تو پھر اب........''

''اب جب میں نے اس کی بات کو اپنا لیا اور یہ سمجھ لیا اس شخص کو مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ اس کے لئے گھر میں پڑی ہوئی دوسری چیزوں جیسی ہی میری بھی حیثیت ہے۔ اس کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کہنا چاہتی ہوں تو

پھر جب یہ میرا اپنا ہے ہی نہیں تو پھر اس پر میرا کیا حق بنتا ہے؟ تو میرا ذہن پر سکون ہو گیا ہے۔ میں بھی بے نیاز ہو گئی۔ میری کوئی خواہش نہیں رہ گئی۔ صرف بچوں کے لئے ساتھ جی رہی ہوں اور گھر وں بچوں کی ذمہ داری اپنی نوکری کے ساتھ نبھا رہی ہوں تو اب شاہ رخ کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ مجھے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے کہ میرا ہے اور اب مجھ سے کہتا ہے کہ میں اس سے اپنی خواہش بیان کروں! اس سے مانگوں۔ کیوں؟ بھیک مانگوں؟ جہاں حق نہیں تھا اور جس حق سے میں خود دست بردار ہو چکی ہوں اس کو میں کیسے قبول کرلوں؟ یہ مرضی تو شاہ رخ کی تھی۔ اب میں لاکھ کوشش بھی کروں تو مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ میرے دل و ذہن کے سارے دروازے اب مقفل ہو چکے ہیں۔
اب شاہ رخ بار بار مجھے اپنے ساتھ لئے جانا چاہتا ہے۔ مجھے یقین دلانا چاہتا ہے کہ میں ہی اس کا مرکز ہوں لیکن نہ مجھے یقین آتا نہ مجھے اس کے ساتھ آنے جانے میں لطف آتا ایک مشین کی طرح یہ کام بھی کر لیتی ہوں لیکن الجھن ہوتی ہے۔''

تبھی شاہ رخ سامان لے کر آ گیا تو سلطانہ کی سوچ تھم گئی سامان رکھتے ہوئے شاہ رخ نے کہا ''چلو بچے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔''

''ہاں اب اور کام بعد میں کریں گے'' سلطانہ کا جواب تھا۔
شاہ رخ اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے انسر کیا پک رہا تھا۔
راستے میں شاہ رخ نے اس سے کہا ''کتنا اچھا لگتا ہے تمہارا ساتھ دل

چاہتا ہے یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔''

''یہ کب سے؟'' سلطانہ کے دل میں خیال گونجا۔ اس کا ذہن اندر ہی اندر ہنسا۔ ''ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟'' ذہن میں آیا لیکن خاموش رہی۔ لیکن ذہن خاموش نہیں تھا۔''

''میں اس شخص کے ساتھ چل رہی ہوں یا شاید گھوم رہی ہوں لیکن بیدلی سے کوئی لطف کوئی مزہ نہیں اور یہ میرا شوہر ہے۔ کیا میرے اندر کی عورت مر گئی ہے؟''

''نہیں'' اس کے ذہن کا جواب تھا۔ ''فرائڈ کا قول اگر صحیح مانے تو جنس مخالف کی کشش ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ تو کیا مجھ میں برقرار ہے؟''

اس نے خود سے سوال کیا۔

او ذہن فوراً آفس میں گذرے واقعات اور باتوں کی طرف چلا گیا۔'' جب راجہ کے ساتھ مل کر آفس کا کام کرتی ہوں تب تو اچھا لگتا ہے۔ جب حرمت کے ساتھ حالات حاضرہ پر بات چیت کرتی تو بھی خوش رہتی ہوں جب ماتھر کے ساتھ چائے یا کافی پیتی ہوں تو مگن رہتی ہوں۔ کیوں؟ کیا میں ان سے محبت کرتی ہوں؟ ایک ساتھ سب سے؟ نہیں اس محبت کا روپ الگ ہے۔ یہ سب میرے دوست ہیں۔ جیسا جذباتی لگاؤ ان کو مجھ سے ہے ویسا ان لوگوں سے مجھے نہیں۔ یہ محبت محبوب والی محبت نہیں ہے۔ میں نے شاید شاہ رخ سے ایک محبوب کی جذباتی لگاؤ کی چاہت کی تھی جو مجھے نہیں ملی اور تنگ آ کر میں نے اپنے آپ کو شاہ

رخ کے لئے مقفل کرلیا۔ ان دوستوں سے رستوں میں کوئی کھوٹ نہیں ہے اس لئے ان کے ساتھ خوش رہتی ہوں لیکن شاہ رخ سے رشتے میں ضرور کچھ جھوٹ تھا کہ میرے ذہن نے اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔''

پھر اب شارہ رخ مجھ سے وہ سب کہوں چاہتا ہے۔ جس کے لئے اس نے مجھے ہمیشہ جھڑکا۔ میں نے اس کے کھینچے پردے کو اب جب قبول کر لیا ہے تو پھر اس کو کیوں ضد ہے کہ میں اپنے خول سے باہر نکلوں۔ وہ جس کو میرے کسی دکھ سکھ سے مطلب نہیں تھا۔ اور جب کچھ بتاتی تھی تو چڑھ جاتا تھا کہ'' میرے Nerves پر کیوں سوار رہنے کی کوشش کرتی ہو؟''

اور اب جب میں نے وہ سارے خط کھینچ لئے ہیں تو مجھے وہاں سے کیوں کھینچ رہا کیا میری اس بے نیازی سے اس کی Superego کو کوئی ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ مجھے قریب کرنے کی کوشش اس کی محبت تو ہرگز نہیں ہو سکتی تو ضرور کہیں اس کی Posses کرنے کی خواہش تو مجبور نہیں کر رہی ہے۔ اب یہ بار بار مجھ سے کیوں کہتا ہے کہ میں اس کا مرکز ہوں۔ ایک بار اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ''میں نے اگر تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک کیا تو معاف کر دو'' اگر؟............اس پر اعتبار کرنا چاہئے۔ ''نہیں'' سلطانہ کا دماغ چیخا.........یہ تیرا نہیں ہے۔''

''اور تبھی اسکوٹر رک گئی۔ گھر آ گیا تھا۔ گھر.... ماں ہے۔ گرہستن ہے پر بیوی ہوتے ہوئے بھی بیوی نہیں ہے۔